ماہنامہ

اِنذار

مئی 2018ء

مدیر
ابو یحییٰ

یہ فانی زندگی آنے والی ابدی زندگی میں
سب کچھ پانے کا واحد موقع ہے،
اسے فانی زندگی میں سب کچھ پانے
کی خواہش میں ضائع نہ کیجیے

www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

مئی 2018ء شعبان/رمضان 1439ھ

جلد 6 شمارہ 5

فی شمارہ ــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرآرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

ابویحییٰ کے قلم سے

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

جس نے خدا کو پالیا

انسان معلوم کائنات کی سب سے زیادہ غیر معمولی ہستی ہے۔ یہ بیک وقت حیوانیت اور روحانیت، عقلیت اور جذباتیت، انانیت اور عبدیت کے احساس اپنے اندر رکھتا ہے۔ انسانوں کی یہی وہ غیر معمولی خصوصیت ہے جس نے اس کے لیے دنیا کے سب سے بڑے امکان کا دروازہ کھولا ہے۔ وہ امکان یہ ہے کہ وہ ایک مادی دنیا میں رہ کر نظر نہ آنے والے خدائے رحمٰن کو دریافت کرلے اور ہمیشہ کے لیے جنت کی بادشاہی کا انعام حاصل کرلے۔

اس دنیا میں انسان ایک حیوان کی طرح کھانے، پینے اور نسل بڑھانے کا محتاج ہے۔ مگر عین ان تقاضوں کی تکمیل کے وقت اس کی روحانیت تقاضہ کرتی ہے کہ وہ دینے والے کے حضور اپنے سر کو جھکا کر سراپا حمد بن جائے۔ انسان کی عقل کائنات کی عظمت اور وسعت فاش کرتی ہے۔ عین اسی وقت اس کے جذبات یہ چاہتے ہیں کہ اس کائنات کو بنانے والے کی مدح سرائی میں نغمے گائے جائیں۔ انسان کی انا اسے دوسروں کے سامنے جھکنے سے روکتی ہے۔ عین اسی وقت اس کی عبدیت یہ کہتی ہے کہ رب کائنات کے سامنے وہ سر بسجدہ ہو جائے۔

بڑا خوش نصیب انسان ہے جو اپنی روحانیت اور عبدیت کی آواز سن کر اپنے جذبوں کا رخ اپنے خالق کی طرف کر دیتا ہے۔ ایسا انسان گھر بناتا، شادی کرتا اور مال کماتا ہے، مگر زبان پر ہر لمحہ خدا کا ذکر اور دل میں اس کی یاد رہتی ہے۔ اس کی عقل تعلیم، کاروبار اور زندگی کے ہر میدان میں الجھی ہوئی گتھیاں سلجھاتی ہے مگر ساتھ ساتھ اسے یہ بتاتی ہے کہ اپنے آقا کے بغیر وہ کچھ نہیں۔ اس کا دل مالک کی محبت سے بھر جاتا ہے۔ اس کی انا معاشرے میں اس کی منفرد شناخت بناتی ہے، مگر اس کی عبدیت اسے ایک بے شناخت غلام بنا کر مالک کے قدموں میں لا ڈالتی ہے۔

آپ خوش نصیب ہیں، اگر آپ نے خدا کو پالیا، کیونکہ پھر آپ نے دنیا و آخرت میں سب کچھ پالیا۔ آپ نے دنیا کا سکون پالیا۔ آپ نے جنت کا عیش پالیا۔

خدا بول رہا ہے

اللہ تعالیٰ کی ہستی اس دنیا کی سب سے خوبصورت سچائی کا نام ہے۔مگر انسان نے ہر دور میں اس سب سے زیادہ خوبصورت سچائی کو نظر انداز کیا ہے۔ اسے جھٹلایا ہے، اس کی توہین کی ہے۔ مگر خدا کی کریم ہستی اس ظلم عظیم کے باوجود خاموشی سے احسان کیے جارہی ہے۔

اس ظلم عظیم کی ایک شکل خدا کی محبت، عظمت اور عبادت میں دوسروں کو شریک کرنا ہے۔ کسی بت، فرشتے، انسان، پیغمبر، ولی یا مخلوق کی کسی بھی شکل کے سامنے سر جھکانا ہے۔ خدا کے احسانوں کو ان کی طرف منسوب کر کے ان کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ مشکل میں ان سے مدد مانگنا ہے۔ خدا کی ذات، صفات اور اختیار میں کسی پہلو سے بھی ان کو شریک سمجھنا ہے۔

اس ظلم عظیم کی ایک دوسری شکل خدا کا انکار ہے۔ عالم طبعی کے اسباب وقوانین میں الجھ کر رہ جانا ہے۔ اسی دنیا کو آخری اور واحد حقیقت سمجھ لینا ہے۔ یہ گرچہ زیادہ بڑی بے وقوفی ہے، مگر صرف اس بنیاد پر کہ خدا نظر نہیں آتا، انسانیت آج اسی بے وقوفی میں مبتلا ہے۔

اس ظلم عظیم کی تیسری شکل اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے پیغمبروں سے کلام کر کے انسانیت تک اپنی بات پہنچائی ہے۔ مگر انسانوں نے ہر دور میں پیغمبروں کا انکار کیا۔ آخری دفعہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کر کے اپنا کلام براہ راست قرآن مجید کی شکل میں انسانوں کے پاس پہنچا دیا۔ مگر بد قسمتی سے لوگوں نے اس عظیم اہتمام کی کوئی قدر نہ کی۔

کتنی عجیب بات ہے کہ خدا بول رہا ہے، مگر کوئی اسے سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں۔ خدا بول رہا ہے اور لوگ دوسری چیزوں کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ خدا بول رہا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ جو خدا نے کہا وہ کافی نہیں اور ان چیزوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے اہمیت نہیں دی۔

جن لوگوں نے آج خدا جیسی بے مثل ہستی کی ناقدری کی ہے، کل انھیں اس کا انجام بھگتنا ہوگا۔ خدا کو نظر انداز کرنے والوں کے لیے خدا کی بادشاہی میں ذلت کے سوا کچھ نہیں۔

الفاظ کا جادو

انسان کو جو صفات عطا کی گئی ہیں، ان میں سے گویائی ایک انتہائی غیر معمولی صفت ہے۔ اس صفت نے دو پایوں کے ایک گلے کو ایک ایسے سماج میں بدل دیا جس نے اپنی مشترکہ قوت سے تمام مخلوقات کو شکست دے دی۔ یہ بیان و کلام کا وصف ہی ہے جو انسانوں کو جوڑتا، کمزوروں کو حوصلہ دیتا، مایوس، دکھی اور پریشان حال کی امیدوں کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔

اس حقیقت کا تجربہ ہم میں سے ہر شخص کو اس وقت ہوتا ہے جب کوئی دوسرا ہمیں مشکل حالات میں مخاطب کرتا ہے اور ہماری ڈھارس بندھاتا ہے۔ ہم اس کی باتوں سے ایک حوصلہ پاتے ہیں۔ ہمارا دل مضبوط ہو جاتا ہے۔ مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔ مسائل کا حل نکل آتا ہے۔ منزل کا راستہ مل جاتا ہے۔ یہ انسانی کلام کا اثر ہے۔

اس دنیا میں خدا کا کلام بھی پایا جاتا ہے۔ اس نے بھی ہم سے گفتگو کی ہے۔ وہ بھی ہم سے مخاطب ہوا ہے۔ اس نے بھی ہمیں بتایا ہے کہ مشکل میں مجھ ہی پر بھروسہ کرو۔ اس نے بتایا ہے کہ خدا کی یاد دلوں کا سکون ہوتی ہے۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ محرومیوں پر صبر کرنے والوں کا اجر بے حساب ہے۔ اس نے کہا ہے کہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔

اس نے زندگی کے سفر کی منزل کو جنت کی منزل کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس نے اس راہ میں آنے والی جہنم کی دلدل سے متنبہ کیا ہے۔ اس نے ہر اس راستے کی طرف رہنمائی کی ہے جو دنیا و آخرت میں فلاح کا باعث ہے۔ ہر اس پگڈنڈی سے بچایا ہے جو آخرت کے خسارے کی طرف لے جاتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ انسان خدا کے سوا سب کی سنتا ہے۔ خدا کے سوا سب سے حوصلہ پاتا ہے۔ خدا کے سوا سب سے رہنمائی لیتا ہے۔ کیسی عجیب تھی یہ نعمت جو انسان پر کی گئی۔ اور کتنی عجیب ہے یہ محرومی جو انسانوں نے خود اپنے لیے چن لی۔

سوف تعلمون

قرآن مجید کی سورہ تکاثر کی پہلی آیت کا مفہوم ہے کہ تم کو زیادہ کی حرص نے غفلت میں رکھا یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔ اسی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ابن آدم کے پاس مال و دولت سے بھری دو وادیاں ہوں تب بھی وہ تیسری کی خواہش کرے گا۔ ابن آدم کا پیٹ قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھرتی، (بخاری، رقم 6436)۔

ہم میں سے ہر شخص دوسروں کو اپنے سامنے مرتا ہوا اور دفن ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کفن میں جیب نہیں ہوتی اور قبر میں مٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود ہماری غفلت ختم نہیں ہوتی۔ ہماری حرص و ہوس ختم نہیں ہوتی۔ ہم مال کو رشوت، حرام، دھوکے اور جھوٹ سے کماتے ہیں۔ ہم مال کو سینت سینت کر رکھتے ہیں۔ ہم مال کو دوسروں پر خرچ نہیں کرتے۔ ہم مال کو اسراف اور نمود و نمائش پر اڑاتے ہیں۔ ہم مال کی محبت میں متوالے ہوئے جاتے ہیں۔

مگر قرآن یہ کہتا ہے کہ **سوف تعلمون** تم عنقریب جان لو گے کہ جس مال کے پیچھے تم نے آخرت کو گنوایا، جس مال کے پیچھے خدا کے غضب کو بھڑکایا، جس مال کے پیچھے اللہ کے احکام کو نظر انداز کیا، جس مال کے پیچھے مظلوموں کی بددعائیں لیں، جس مال کے پیچھے حقداروں کے حقوق دبائے؛ وہ مال برباد ہو گیا۔ آخرت کی حقیقی دنیا میں اس کی اہمیت کچھ نہیں۔

یہ وقت بہت سے لوگوں پر آ چکا ہے۔ بہت جلد ہم پر بھی آنے والا ہے۔ مگر ہم کلام خدا کی پکار سننے کے لیے تیار نہیں۔ ہم رسول خدا کی پکار سننے کے لیے تیار نہیں۔ ہم خود کو حلال تک محدود کرنے کو تیار نہیں۔ ہم حقداروں پر مال خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہم نمود و نمائش، اسراف اور بخل چھوڑنے پر تیار نہیں۔ مگر عنقریب موت ہمیں بھی بتا دے گی کہ مال کچھ نہیں تھا۔ دنیا کچھ نہیں تھی۔ اصل فلاح اور اصل کامیابی آخرت کی کامیابی تھی، مگر اُس وقت بہت دیر ہو چکی ہو گی۔

مال ایک نعمت

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مال کو خیر (البقرہ 180:2) اور قیام زندگی کا ایک ذریعہ (النساء 5:4) قرار دیا ہے۔ مال اور اسباب دنیا کی اتنی بڑی نعمت ہیں کہ ان کو اگر صحیح جگہ استعمال کیا جائے تو آخرت میں خدا کا قرب اور جنت کے اعلیٰ درجات کا موثر ترین ذریعہ بن جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے مال و دولت کے متعلق یہ تصور پیدا ہوا ہے کہ دنیا کا مال، اس کی زینت اور خوبصورتی کوئی اچھی چیزیں نہیں۔ حالانکہ قرآن مجید نے اس نقطہ نظر کی غلطی اس سوال کی شکل میں واضح کی ہے کہ دنیا کی وہ خوبصورتیاں اور زینتیں جن کو اللہ نے اپنے نیک بندوں کے لیے نکالا ہے، ان کو کس نے حرام کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ مال ہو کہ جمال سب اللہ کی غیر معمولی نعمتیں ہیں۔ ان کا شاید سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے انسان کو خدا کی جنت کا ایک زندہ تعارف حاصل ہوتا ہے۔ جنت مادی نعمتوں، آسائشوں اور زینت و جمال سے آراستہ زندگی کا نام ہے۔ اگر کسی بندہ مومن کو اسی دنیا میں یہ نعمتیں مل جائیں اور اس کا ایمانی ذوق زندہ ہو تو یہ نعمتیں اسے غافل نہیں کرتیں بلکہ خدا کی یاد، اس کی شکرگزاری، اس کی محبت اور اس کی جنت کے تعارف کا ایک بہترین ذریعہ بن جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مال میں کوئی خرابی نہیں۔ دنیا کی نعمتوں میں کوئی خرابی نہیں۔ خرابی ناشکری میں ہے۔ خرابی غفلت میں ہے۔ خرابی مال کو اپنی صلاحیت کا نتیجہ سمجھنے میں ہے۔ خرابی حرام طریقے سے مال کمانے میں ہے۔ خرابی دھوکے، رشوت، غبن، ملاوٹ، جھوٹی قسم اور اسی طرح کے دیگر ذرائع سے مال حاصل کرنے میں ہے۔ خرابی حرص و ہوس میں ہے۔ خرابی بخل، اسراف، نمود و نمائش میں ہے۔ خرابی حق داروں کو مال نہ دینے میں ہے۔ خرابی زکوۃ، انفاق اور فی سبیل اللہ مال خرچ نہ کرنے میں ہے۔ جو شخص ان خرابیوں سے بچ گیا، اس کے لیے مال خدا کے قرب کا ایک ذریعہ ہے۔

آدم کو سکھائے جانے والے نام

سورہ بقرہ آیت 31 میں حضرت آدم علیہ السلام کے حوالے سے یہ بیان ہوا ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے تمام اسماء سکھائے تھے۔ ان اسماء یا ناموں کی تفسیر میں تین قول نقل ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد تمام چیزوں کے نام ہیں۔ دوسرا یہ فرشتوں کے نام ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد تمام ذریت آدم کے نام ہیں۔ صاحب تدبر قرآن نے یہ تینوں اقوال نقل کرنے کے بعد تیسرے کو ترجیح دی ہے۔ اس کی تفصیل تدبر قرآن میں اس آیت کی تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اس آخری قول کے مطابق ان آیات کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جب زمین میں خلیفہ بنانے کا اعلان کیا تو فرشتوں نے سوال کیا کہ کیا آپ کسی ایسے کو یہاں خلیفہ بنائیں گے جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے۔ چنانچہ اس اعتراض کا جواب دینے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی ذریت اور خاص کر انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کا تعارف کرایا گیا۔ یہی وہ لوگ تھے جو ہر دور میں اپنے قول و فعل سے زمین پر عدل، خیر و صلاح پھیلاتے رہے۔ چنانچہ فرشتوں کو یہ بتا دیا گیا کہ برے لوگوں کے ساتھ اولاد آدم میں اچھے لوگ بھی پیدا ہوں گے اور یہی وہ گروہ قلیل ہے جس کا حاصل کرنا مقصود ہے۔

آیات کی یہ تفسیر سیاق کلام کے عین مطابق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری کسی صورت میں فرشتوں کے اس اعتراض کا جواب سامنے نہیں آتا کہ انسان زمین میں فساد برپا کرے گا۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام اور اولاد آدم کے پاس ہر چیز کا علم ہو اور وہ سارے فرشتوں سے بھی واقف ہوں تو اس سے فساد نہ ہونے کا کیا تعلق ہے؟ ظاہر ہے کہ انسان ہر دور میں علم کے باوجود فساد مچاتے رہے ہیں اور پہلا فسادی یعنی ابلیس تو ویسے بھی فرشتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس لیے اس طرح کی کسی چیز کا علم اس اعتراض کا جواب نہیں تھا۔

اصل جواب صرف یہی تھا کہ بے شک زمین میں بہت سے لوگ فساد مچائیں گے، خونریزی کریں گے، دوسروں کی جان، مال اور آبرو کو نقصان پہنچائیں گے۔ مگر بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو فساد مچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود عدل و انصاف پر قائم رہیں گے اور ہر پہلو سے اپنا مثبت کردار ادا کریں گے۔ یہی وہ کردار ہے جو تاریخ کے ہر دور میں اولاد آدم کے ایک گروہ نے سرانجام دیا ہے اور آج بھی بکثرت ایسے لوگ موجود ہیں جو اسی سیرت و کردار کے حامل ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے فساد کی خرابی اللہ تعالیٰ نے گوارا کی ہے۔

تاہم زبان و بیان کے پہلو سے اس رائے پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کیا محض کسی کا نام بتانا اس کا تعارف کرانے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس کا جواب خود قرآن مجید نے سورہ رعد آیت 33 میں دیا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں یہ بتاتے ہوئے کہ وہ ہر شخص کے ہر عمل کی خبر رکھتے ہیں، مشرکین سے سوال کیا ہے کہ تم نے اللہ کے جو شریک بنائے ہیں ان کے نام بتاؤ؟ (قُلْ سَمُّوهُمْ)۔

یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ بتوں کے نام نہیں پوچھ رہے کہ جواب میں لات، منات، ہبل اور عزیٰ وغیرہ کا نام لے دیا جائے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ان شرکاء کا تعارف کرا کے یہ تو بتاؤ کہ ان میں کیا خصوصیات ہیں؟ وہ کیا صفات ہیں جو انھیں اس خدا کا ہم سر یا شریک بنا دیتی ہیں جو ہر انسان کے ہر عمل سے باخبر ہے۔

یہ آیت قرآن مجید ہی سے زبان و ادب کا وہ نمونہ سامنے لا رکھتی ہے جس میں بارہا نام بتانے یا پوچھنے کی تعبیر تعارف کے ہم معنی بن جاتی ہے۔ قرآن مجید چونکہ اعلیٰ ادبی اسلوب میں نازل ہوا ہے جس میں اس طرح کا اختصار اور ایجاز معمول کی بات ہے، اس لیے ایسے اسالیب اختیار کر لیے جاتے ہیں۔ اچھا ادبی ذوق رکھنے والے ان کو سمجھنے میں غلطی نہیں کرتے۔

دنیااورآخرت میں کامیابی کا اصول

ہم میں سے ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دنیا میں بہتر سے بہتر مقام حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ مال ودولت، گاڑی وگھر اور مقام ومرتبے میں دوسروں سے بہتر ہو۔تاہم قرآن مجید نے اس حوالے سے لوگوں کا نقطہ نظر بدلنے کی کوشش کی ہے۔انھیں بتایا ہے کہ اس دنیا میں جو بعض لوگوں کو برتری دی جاتی ہے وہ آخرت کی اسکیم کو دنیا میں سمجھانے کا ایک ذریعہ ہے۔ قرآن مجید نے سورہ بنی اسرائیل میں دیگر چند حقائق کے ساتھ یہ بات اس طرح بیان کی ہے۔

''جواس دنیا ہی کو چاہتا ہے، اُس کو ہم جس کے لیے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں، سر دست یہیں دے دیتے ہیں۔ پھر اُس کے لیے ہم نے جہنم رکھ چھوڑی ہے، جس میں وہ خوار ورواندہ ہوکر داخل ہوجائے گا۔اور جو آخرت چاہتا ہے اور اُس کے لیے کوشش بھی کرتا ہے، جیسی کوشش اُس کے لیے کرنی چاہیے، اور مومن بھی ہے تو یہی لوگ ہیں جن کی سعی مقبول ہوگی۔ تیرے پروردگار کی بخشش سے ہم ہر ایک کو مدد پہنچاتے ہیں، اِن کو بھی اور اُن کو بھی۔اور تیرے پروردگار کی بخشش کسی پر بندنہیں ہے۔دیکھ لو اِن کو کس طرح ایک دوسرے پر ہم نے فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت کے درجے اور اُس کی فضیلت تو کہیں بڑھ کر ہے۔''

قرآن مجید نے اس مقام پر بڑی خوبصورتی سے چند حقائق کو واضح کر دیا ہے جو ہر شخص کو سمجھ لینے چاہئیں۔ان میں سے بعض حقائق کو تقابل کے اصول پر حذف کر دیا گیا ہے اس لیے ہم ان کو کھول کر بیان کررہے ہیں۔پہلی حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں خدا جس کو جو بھی دیتا ہے وہ اس کی نیکی وبدی کی بنیاد پر نہیں دیتا بلکہ اپنی اُس حکمت کی بنیاد پر دیتا ہے جس کے تحت اس نے یہاں کسی کو فقیر بنایا اور کسی کو بادشاہ۔کسی کو مالدار بنایا اور کسی کو غریب۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان جو پاتا ہے اپنی کوشش سے پاتا ہے۔آپ محنت کریں گے تو کامیاب ہوں گے۔تجارت کریں گے تو نفع پائیں گے۔ملازمت کریں گے تو تنخواہ

پا ئیں گے۔لیکن یہ ضروری نہیں کہ سب کو وہ ملے جوانھوں نے چاہا یا اتنا ملے جتنی انھوں نے محنت کی۔ بلکہ یہ بھی اللہ کی حکمت ہے کہ وہ کسی کی محنت کو پوری طرح موثر ہونے دیتا ہے اور کوئی بہت محنت اور جدو جہد کے باوجود پورا نتیجہ حاصل نہیں کر پا تا۔

تیسری یہ کہ جو لوگ دنیا کے لیے محنت کرتے ہیں اور آخرت میں خدا کی پکڑ سے بے نیاز ہوکر حرام اور نافرمانی کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔گر چہ دنیا میں بھی ان کو اتنا ہی ملے گا جتنا ان کا مقدر تھا۔ وہ حرام اختیار نہ کرتے تب بھی ان کا نصیب وہی تھا جو انھوں نے پایا۔گویا حرام کی وجہ سے ان کا رزق تو نہیں بڑھا،مگر آخرت ہاتھ سے ضرور نکل گئی۔

چوتھی حقیقت یہ ہے کہ بندہ مومن حلال راستے سے بھی وہی پا تا ہے جتنی اس نے محنت کی اور جتنا اس کے لیے اللہ کا فیصلہ تھا۔ ہاں مگر بندہ مومن چونکہ حلال کو ملحوظ رکھتا ہے اور ہر معاملے میں اللہ کی رضا کا راستہ اختیار کرتا ہے تو دنیا میں گر چہ اسے وہی ملا جو اس کا نصیب تھا،مگر آخرت میں اس کی نیکیوں کا بدلہ جنت ہوگی۔

آخری اور سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں لوگوں کو مال و دولت کی جو فضیلت دی گئی ہے وہ اس لیے نہیں دی گئی کہ لوگ جائز و ناجائز سے بے پروا ہوکر اس کے پیچھے لگیں۔ بلکہ اس لیے دی گئی ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر یہ سبق سیکھیں کہ آخرت کی دنیا میں بھی کچھ لوگ بہت زیادہ اوپر ہوں گے اور کچھ نیچے۔انسان کسی برتر کو دیکھے تو اسے دیکھ کر جنت کا بلند مقام پانے کی خواہش ہونی چاہیے اور پھر اس کے لیے محنت کرنی چاہیے۔لوگ یہ کرتے نہیں اور اس کے بجائے دوسروں کی حرص میں آخرت کو بھول کر دنیا میں بلند مقام کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ان کو ملتا تو وہی ہے جو خدا کا فیصلہ ہوتا ہے مگر اس عمل میں وہ اپنی آخرت ضرور گنوا دیتے ہیں۔

اپنی میزان

سورہ رحمٰن قرآن مجید کی ایک بڑی خوبصورت سورت ہے۔اس کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وقدرت کی نشانیوں کے ضمن میں ایک بات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''اس نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں میزان قائم کردی ہے کہ تم بھی میزان میں تجاوز نہ کرو اور ٹھیک تولو انصاف کے ساتھ اور وزن میں کمی نہ کرو''، (الرحمٰن 55:9-7)

ان آیات میں میزان کا لفظ جب وزن کے ساتھ استعمال ہوا ہے تو ترازو کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ تاہم پہلی آیت میں آسمان کے ساتھ میزان لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے۔ یعنی آسمان اور اس میں موجود تمام اجرام فلکی اگر بغیر کسی سہارے کے فضا میں بلند نظر آتے اور اپنے متعین دائروں میں گردش کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک ضابطے قاعدے کا پابند کر رکھا ہے۔

یہ اصل تصور ہے جس کے بیان کے لیے آسمان میں میزان رکھنے کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ اس کی اصل خوبصورتی یہ ہے کہ جس طرح میزان یا ترازو کے دونوں پلڑوں میں وزن اور شے برابر رکھے جائیں تو ترازو کے دونوں پلڑے ہاتھ لگائے بغیر فضا میں معلق ہو جاتے ہیں اسی طرح آسمان اور اجرام فلکی بغیر کسی ظاہری سہارے کے فضا میں معلق ہیں۔

اپنی اس عظیم قدرت کی طرف توجہ دلا کر اللہ تعالیٰ نے اس سے متعلق جو چیز بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح میں نے آسمان پر ایک میزان رکھی ہے، زمین پر میں نے تمھارے ہاتھوں میں بھی ایک میزان تھمائی ہے۔ تم بھی اپنے دائرے میں عدل، ضابطے، قاعدے کی یہی میزان قائم رکھو اور اس میں تجاوز نہ کرو۔ پھر اس کی ایک مثال بالکل واضح طور پر ناپ تول کے پیمانے سے دے دی ہے کہ تم وزن پورا تولو اور اس میں کمی نہ کیا کرو۔ میزان یا ترازو کو زندگی میں قائم و دائم

رکھنا ہی وہ بنیادی دینی مطالبہ ہے جسے قرآن مجید دیگر مقامات پر عدل وانصاف کے عنوان سے بیان کرتا ہے۔ جنت اسی بنیادی مطالبے کو ماننے کا نتیجہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی تمام کی تمام ایک نازک توازن پر قائم ہے۔ یہ توازن رشتوں اور تعلقات کا توازن ہے۔ میاں بیوی، اولا دوالدین، بھائی بہن، اقربا و احباب، مستقل اور عارضی پڑوسی، استاد اور شاگرد، آجر اور اجیر، تاجر اور گاہک، ریاست اور فرد اور سب سے بڑھ کر بندے اور رب کا تعلق ہی وہ ڈور ہے جس میں تمام انسان ہر وقت بندھے ہوتے ہیں۔ ہم اپنے مفاد، خواہش اور انانیت کی وجہ سے اکثر و بیشتر ان تعلقات میں دراڑ ڈال دیتے ہیں۔ جب ہم ایسا کرتے ہیں تو ہم اس میزان میں تجاوز کر دیتے ہیں جسے خدا نے آسمان میں رکھنے کے بجائے زمین پر ہمارے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

اس تجاوز کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے لینے اور دینے کے پیمانے بالکل جدا ہوتے ہیں۔ ہم دوسروں کی غلطیاں یاد رکھتے ہیں، اپنی بھول جاتے ہیں۔ ہم دوسروں کے فرائض یاد رکھتے ہیں، اپنے فراموش کر دیتے ہیں۔ ہم دوسروں کی آنکھ میں تنکے ڈھونڈتے ہیں اور اپنی آنکھ کے شہتیر کو دیکھنے کے لیے اندھے بن جاتے ہیں۔ ہم اپنی خواتین کے لیے تحفظ چاہتے ہیں، مگر دوسروں کی خواتین کو وہ تحفظ اور احترام دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اپنی بہو سے بدسلوکی کرتے ہیں اور بیٹی کی سسرال سے حسن سلوک کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم تنخواہ پوری لیتے ہیں، کام پورا نہیں کرتے یا کام پورا لیتے ہیں، لیکن تنخواہ بہت کم دیتے ہیں۔

ہم یہ سب کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں جو میزان تھمائی گئی ہے وہ عنقریب ہم سے لے لی جائے گی۔ اور پھر ہمارا سخت ترین احتساب شروع ہوگا۔ جب یہ ہوگا تو تجاوز کرنے والوں کا انجام جہنم کی آگ کے سوا کچھ اور نہیں ہوگا۔

ابو یحییٰ

تبدیلی کا عظیم موقع

انسان اس دنیا میں ایک محدود وقت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس محدود وقت میں بھی باشعور اور صحت مند زندگی کا دورانیہ پچاس برس سے زیادہ نہیں ہوتا۔ سرسری نظر سے دیکھنے پر پچاس برس کی مدت بڑی طویل محسوس ہوتی ہے۔ مگر تجزیہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ پچاس برس کی مدت بھی اتنی ہی تیز رفتاری سے گزر جاتی ہے جتنی تیزی سے ایک لمحہ گزر جاتا ہے۔ یہ بات اس شخص سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے جو بزرگی کی حدود میں داخل ہو چکا ہو۔

ایسے کسی شخص کے پاس کبھی بیٹھ کر ضرور پوچھنا چاہیے کہ ساٹھ ستر برس کی یہ عمر آپ کو اس لمحے کیسے محسوس ہوتی ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ ایک لمحہ سے زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے زاویے سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہر فرد سے پہلے اس دھرتی پر ہزاروں نسلیں گزر چکی ہیں۔ ہمارے دادا پردادا بھی اسی دھرتی پر بستے تھے۔ مگر آج وہ اور ان کا نام ونشان بھی دھرتی سے مٹ چکا ہے۔ کل یہی انجام ہمارا مقدر رہے۔

ہمارا یہ انجام اگر فنا ہو جانے کا نام ہوتا تو پھر بھی کوئی حرج نہ تھا۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ آگے ہمیں کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی کا سامنا کرنا ہے۔ اس زندگی میں ہمیں وہی گھر، وہی ٹھکانہ، وہی لباس، وہی رنگ وروپ، وہی مال واسباب ملے گا جیسی اس دنیا میں ہماری شخصیت بنی ہوگی۔ اگر ہماری شخصیت سرکش، ظالم، غافل، دنیا پرست، مفاد پرست، بے اصول، بداخلاق، بدکار، بے حیائی اور تعصب کی اساسات پر بنی ہے تو کل قیامت کے دن جہنم ہمارا ٹھکانہ ہوگا۔ آگ ہمارا انجام ہوگی۔ لباس تارکول کا ہوگا۔ شکل بدصورت اور جسم بدہیئت ہوگا۔ کھولتا ہوا پانی اور

خاردار کانٹے کھانے پینے کا سامان ہوگا۔قید، مار پیٹ، ذلت ورسوائی اور ہمہ وقت ذہنی اورنفسیاتی اذیت ہماراانجام ہوگی۔

اس کے برعکس اگر بندگی، خدا خوفی، عدل، احسان، انفاق، صبر، تحمل، حسن خلق، عفت اور اصول پسندی ہماری شخصیت رہی تو جنت کا ابدی گھر ہمارا منتظر ہے۔ وہاں ریشم وحریر، اطلس و دیبا ہمارا لباس ہوگا۔حسن، جوانی اور دلکشی سے آراستہ شباب ہمارا رنگ وروپ ہوگا۔ پاکیزہ اورلذیذ مشروبات اور مرغ و ماہی کے طعام ہماری خوراک ہوں گے۔ ہر طرح کی سلامتی اور ہر جگہ عزت کے کلمات کے ساتھ ہمارا استقبال ہوگا۔خوشی، کامیابی، مقصدیت اور سرشاری سے مزین ختم نہ ہونے والا ذہنی سکون ہمارا مقدر ہوگا۔

یہ طے ہے کہ ان میں سے کوئی ایک انجام ہمارے سامنے بہت جلد آنے والا ہے۔ اس انجام کا انحصار ہماری شخصیت اور رویے پر ہے۔ ایسے میں ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اپنی شخصیت کو بدلنے اور بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔مگر بدقسمتی سے ایسی کسی کوشش کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کوئی اور نہیں خود ہمارا اپنا نفس اور اس کی خواہشات ہیں۔ دور حاضر میں ان سے ٹکرانا دنیا کا مشکل ترین کام بن گیا ہے۔ پھر مسئلہ صرف خواہشات ہی کا نہیں بلکہ عادات، معمولات، مصروفیات اور ماحول سب کچھ ہماری راہ میں رکاوٹ بنا رہتا ہے۔ان حالات میں خود کو تبدیل کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔

رمضان کی نعمت

مگر ایسے میں اللہ تعالیٰ نے رمضان میں روزوں کی عظیم عبادت کو فرض کر کے ہمیں ایک زبردست موقع فراہم کیا ہے کہ ہم خود کو بدلنے کی طرف پہلا قدم خدا کی رہنمائی اور اس کی عطا کی ہوئی آسانی میں اٹھا سکیں۔

ہماری راہ میں اگر ہمارا نفس سب سے بڑی رکاوٹ ہے تو اس نفس سے مقابلہ کرنے بلکہ دنیا بھر سے لڑنے اور مقابلہ کرنے والی سب سے بڑی طاقت یعنی ہماری قوت ارادی بھی ہمارے اپنے اندر ہی موجود ہے۔ عام حالات میں ہمیں اس عظیم طاقت اور اس عظیم خزانے کا علم نہیں ہوتا۔ مگر روزہ آتا ہے اور ہم حیرت انگیز طور پر اپنی اس طاقت کو استعمال کرنے لگتے ہیں۔ جو لوگ ایک وقت کا کھانا نہیں چھوڑ سکتے وہ پورا دن بھوکا رہنے کی ہمت پیدا کر لیتے ہیں۔ جو لوگ کئی لیٹر پانی روزانہ پی جاتے ہیں وہ گرم روزے میں ایک قطرہ پانی بھی حلق سے نیچے نہیں اتارتے۔ انسان شادی شدہ ہوتے ہوئے، روزے کی حالت میں میاں بیوی کے اس جائز رشتے سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ مسجدیں بھرنے لگتی ہیں۔ نوافل کی کثرت ہوتی ہے۔ مال خرچ کیا جاتا ہے۔ تلاوت قرآن کا اہتمام ہونے لگتا ہے۔ سونے جاگنے کے اوقات بدل جاتے ہیں۔ نیند اور آرام کی قربانی دی جاتی ہے۔ غرض ہر پہلو سے ایک جامع اور ہمہ گیر تبدیلی آ جاتی ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اپنے اندر یہ عظیم تبدیلی لاتے ہیں، مگر نہیں جان پاتے کہ یہ تبدیلی کیوں آئی ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ ماحول کا اثر ہوتا ہے کہ جب سب لوگ ہی اپنے معمولات کو بدل رہے ہوتے ہیں تو ہم بھی ایسا ہی کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ مجبوری ہوتی ہے کہ بچپن سے روزے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اس لیے عادتاً رمضان میں اپنے معمولات بدل لیے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہ کوئی پراسرار شے ہے جو رمضان کے ساتھ خاص ہے اور رمضان جاتے ہی رخصت ہو جاتی ہے۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ اول تا آخر ہماری قوت ارادی کا کارنامہ ہے جو ہمیں اتنی طاقت اور ہمت عطا کر دیتا ہے کہ گرم موسم کے طویل روزوں میں ہم بھوک اور پیاس برداشت کر لیتے

ہیں۔ جسمانی تھکان، سر درد، مضمحل اعضا وقوی کے باوجود ایک کے بعد ایک روزہ رکھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی میں رت جگے بھی ہوتے ہیں۔ اسی میں معمولات پر بھی ضرب لگتی ہے۔ مگر ہم ہر چیز خوش دلی سے برداشت کر لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ رمضان کے ان روزوں کے ذریعے سے ہمیں ہمارے اندر پوشیدہ طاقت کے اس غیر معمولی خزانے سے متعارف کرادیتے ہیں۔ ہم ایک دفعہ اس طاقت کے سرچشمے کو دریافت کرلیں تو پھر انسان پہاڑوں کو بھی اپنی راہ سے ہٹا سکتا ہے۔

رمضان کا ایک مہینہ زندگی سے زیادہ طویل نہیں۔ یہ بھی جلد ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر اس رمضان میں ہم نے اپنی قوت ارادی کے عظیم خزانے کو دریافت کرلیا، اپنی اس لگام کو دریافت کرلیا جو نفس کے سرکش اور منہ زور گھوڑے پر با آسانی قابو پاسکتی ہے تو پھر ہمارا نفس کبھی اور کسی صورت بے قابو نہیں ہوسکتا۔ یہ لگام ہمیں مجبور کرے گی کہ جائز اور حلال چیزیں اگر چھوڑ دی ہیں تو حرام کو بھی چھوڑ دیں۔ روزوں کی مشقت اگر خوش دلی سے جھیلی ہے تو زندگی کے ہر سرد و گرم کو عارضی سمجھ کر جھیلنا سیکھیں۔ رمضان میں مسجد جانا سیکھا ہے تو رمضان کے بعد بھی یہ سبق یاد رہے۔ قرآن کو رمضان میں پڑھا تو بعد میں بھی اس سے ناتا نہ توڑیں۔

اس پہلو سے رمضان زندگی کو بدلنے کا ایک عظیم موقع ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ایک دفعہ پھر ہمیں عطا فرمایا ہے۔ آئیں! اس رمضان میں صرف روزے ہی نہ رکھیں بلکہ طاقت کے عظیم سرچشمے یعنی اپنی قوت ارادی کو دریافت کریں اور زندگی کو ہمیشہ کے لیے بدل دیں۔ کیونکہ بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے جب اعلیٰ انسانوں کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور بدکاروں کا ابدی ٹھکانہ سوائے جہنم کے کچھ اور نہ ہوگا۔

جہاں رہیے، بندگان خدا کے لیے رحمت بن کر رہیں، باعث زحمت نہ بنیے۔

سوال و جواب

ابو یحییٰ

روزہ چھوڑنے کی رخصت

سوال: قرآن وحدیث کے حوالے سے روزہ چھوڑنے کی رخصت کن حالات میں یا کن افراد کو دی گئی ہے نیز یہ کہ جان بوجھ کر روزہ چھوڑنے پر کیا وعید آئی ہے؟ سحرش مجاہد

جواب: السلام علیکم۔ قرآن مجید نے یہ بات واضح کی ہے کہ مسافر یا مریض روزہ چھوڑ سکتے ہیں۔ انھیں دوسرے دِنوں میں ان روزوں کی قضا رکھنا ہوگی۔ کون روزہ رکھنے کے قابل ہے اور کون نہیں اس کا فیصلہ وہی شخص اپنی حالت اور کیفیت دیکھ کر کرے گا۔ بعض حالات میں ڈاکٹر سے بھی رائے لی جاسکتی ہے جو بیماری کو دیکھتے ہوئے روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کی تجویز دے گا۔ لیکن جو لوگ کسی اور وجہ سے مستقل طور پر روزے رکھنے کے قابل نہیں، مثال کے طور پر معمر یا بزرگ افراد جن کی صحت روزے کا تحمل نہیں کرسکتی، ان پر پھر روزے فرض نہیں رہتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے نصاب سے کم مال رکھنے والے لوگوں پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی۔

جان بوجھ کر روزہ چھوڑنا بڑا گناہ ہے۔ اگر روزہ چھوڑا ہے تو صدق دل سے معافی مانگیں اور چھوڑے ہوئے روزوں کا حساب لگا کر ان کو رکھنا شروع کریں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے۔ ساتھ ہی آئندہ کے لیے اس سے بچنے کا عزم کریں۔

ان تمام معاملات میں ایک اصولی بات سمجھ لینی چاہیے۔ روزہ اللہ کے لیے رکھا جاتا ہے اور بندہ اپنے آقا ہی کو جواب دہ ہے۔ وہ اگر غلط عذر پیش کر رہا ہے تو اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ عذر کمزور ہے تو اس دنیا میں اپنے ضمیر اور آخرت میں اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ ہمیں بے جا سختی کرنے یا دوسروں کے بارے میں کوئی فیصلہ دینے کے بجائے انھیں دین بتانے اور ان کے

رب سے ان کا تعلق مضبوط بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ذیابیطس کے مریض اور روزہ

سوال: ماہ رمضان میں ذیابیطس کے مریض کو روزوں کی مکمل چھوٹ ہے یا سرد موسم میں جبکہ دن طویل نہیں ہوتے، قضا روزے رکھنا لازم ہے؟ سحرش مجاہد

جواب: السلام علیکم۔ ذیابیطس کے مریض کی جسمانی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ وہی شخص اپنی کیفیت اور برداشت کو دیکھتے ہوئے کرے گا۔ اس معاملے میں مزید رہنمائی اس کا طبیب یا ڈاکٹر کرے گا۔ کیونکہ ڈاکٹر ہی اس کی بیماری کی موجودہ صورتحال کے بارے میں بہتر طور بتا سکتا ہے کہ اس پر کس قسم کے اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اگر اس کے لیے سردیوں میں بھی روزہ رکھنا ممکن نہیں یا اسے کوئی ایسی صورتحال پیش آ جائے جو اس کے لیے نا قابل برداشت ہو تو پھر وہ روزے چھوڑ سکتا ہے۔

سحری میں آخر تک کھانا پینا

سوال: ماہ رمضان میں سحری کے دوران لاؤڈ سپیکرز سے مسلسل وقت ختم ہونے کا اعلان سن کر عین آخری لمحات میں حلق خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے اور پھر گنجائش کی حد تک پانی پینے کا سلسلہ اذان ہونے کے دوران بھی جاری رہتا ہے۔ برائے مہربانی یہ بتا دیجیے کہ وقت سحر روزہ کا آغاز اذان کے ابتدائی کلمات ہیں یا بحالتِ مجبوری دورانِ اذان یا اس کے اختتام تک کھانا پینا جائز ہے؟ سحرش مجاہد

جواب: السلام علیکم۔ ہمارے ہاں رواج یہ ہے کہ جب صبح صادق کا وقت ہو جاتا ہے، اذان اس کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اس لیے سحری میں کھانا پینا صبح صادق سے پہلے تک ہونا چاہیے اس کے بعد روزہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اذان کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ

جب اذان ہونے میں وقت باقی ہو اس وقت آپ سحری بند کر دیجیے۔ پانی بھی اس سے کچھ پہلے پی لیجیے۔

یہ صرف نفسیاتی مسئلہ ہے کہ بالکل آخری وقت کا انتظار کیا جائے۔ گھڑیوں کے اس دور میں ہم سب کو معلوم ہوتا ہے کہ سحری کب ختم ہو گی۔ آپ نوٹ کیجیے کہ ہر روز سحری بند ہونے کا وقت بدل جاتا ہے۔ جیسے فرض کریں کہ آج آپ نے عین سحری بند ہونے کے وقت چار بج کر پانچ منٹ پر پانی پیا ہے تو اگلے دن جب سحری بند ہونے کا وقت چار بج کر چار منٹ ہو گا، آپ اسی وقت پر پانی پئیں گی۔ چنانچہ آپ چاہیں تو آج بھی چار بج کر چار منٹ پر پانی پی سکتی ہیں۔ ایک اور منٹ کا انتظار کرنا صرف ایک نفسیاتی تسلی ہے اور کچھ نہیں۔

پھر بھی اگر آپ چاہیں تو آخری وقت تک پانی پی سکتی ہیں لیکن اذانیں شروع ہو جائیں تو پھر کھانا پینا چھوڑ دینا چاہیے۔ تاہم اگر آپ کے ہاتھ میں کچھ ہے تو اس کو پورا کر لیجیے جیسے آپ نے گلاس میں پانی بھر لیا ہے اور اذانیں شروع ہو گئی ہیں تو آپ کو گلاس رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اسے پورا کر لیں جیسا کہ ایک روایت میں بیان ہوا ہے، (احمد، رقم 10637)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دن و رات کے ظہور جیسے مظاہر فطرت سیکنڈوں میں نہیں بلکہ یہ منٹوں میں پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لیے ہاتھ میں موجود چیز کو پورا کیا جا سکتا ہے۔

وسعت اللہ خان

کیپ ٹاؤن شہر نہیں آخری وارننگ ہے

اس بار سردیوں اور بہار میں بارشیں معمول سے چالیس فیصد کم ہوئی ہیں۔لہٰذا دو بڑے ڈیموں (تربیلا اور منگلا) کی جھیلیں بھی آدھی بھری ہوئی ہیں۔چنانچہ اس کا اثر ربیع کی بوائی اور فصل پر بھی پڑ رہا ہے اور پھر یہ اثر ہر طرح کی مارکیٹنگ بھول بھلیوں سے ہوتا جیب کے راستے ہمارے کچن تک پہنچے گا اور پھر میڈیا میں نایابی، کمیابی، ناقص سرکاری پالیسی وغیرہ وغیرہ کی چیختی دھاڑتی ہیڈ لائنز بنیں گی۔کمر توڑ مہنگائی کا روایتی مرثیہ پڑھا جائے گا۔یہ بھی پانچ سو اکیسویں بار کہا جائے گا کہ تربیلا اور منگلا میں جس تیزی سے مٹی بھر رہی ہے اس کے بعد اتنی ہی گنجائش کے کم ازکم تین ڈیموں کی ہنگامی ضرورت ہے تاکہ ہر سال اکیس ارب روپے مالیت کا جو پانی کھیت کے بجائے براہِ راست سمندر پی جاتا ہے اس کا اوپائے ہو سکے۔لہٰذا سیاسی اتفاقِ رائے سے کچھ کیا جائے اور جلد کیا جائے۔

کچھ سیاسی ماحولیاتی گرو دو سو بتیسویں بار یہ بھی بتائیں گے کہ بھارت ہمارے حصے کا پانی روک رہا ہے اور آبی کمیشن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔کچھ خالص ماحولیاتی ماہرین چار سو انچاسویں بار یہ مشورے بھی دیں گے کہ جو پانی دستیاب ہے اسے کیسے کفایت شعاری سے استعمال کر کے اتنی ہی زرعی پیداوار حاصل ہوسکتی ہے جتنی اندھا دھند پانی ضائع کر کے مل رہی ہے۔

درجن بھر اقتصادی ماہرین کسی ٹاک شو میں اڑتیسویں بار یہ بھی بتائیں گے کہ پاکستان میں پانی کی قیمت دیگر ممالک کے مقابلے میں کتنی کم ہے۔اگر ہمیں نئے آبی منصوبوں کو ترقی دینے کے لیے بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچنا ہے اور اپنی مدد آپ کے تحت آبی وسائل کے عاقلانہ استعمال کی حکمتِ عملی اختیار کرنی ہے تو پھر گیس اور بجلی کی طرح پانی

کے بھی نجی اور کمرشل ریٹ مقرر کر کے ''جو جتنا پانی استعمال کرے اتنا پیسہ دے'' کے فارمولے پر چلنا ہوگا۔تب ہی لوگوں میں عقل اور خزانے میں پیسہ آئے گا۔اس برس بھی مارننگ شوز میں بتایا جائے گا کہ کیسے ہم اپنے گھروں میں ٹونٹی کھلی نہ چھوڑیں تو اتنے لیٹر پانی روزانہ بچایا جاسکتا ہے جو کسی اور ضرورت مند کے کام آئے گا۔کوئی ٹیکنالوجسٹ ایک سوانیسویں مرتبہ آئے گا اور بتائے گا کہ کس طرح استعمال شدہ پانی کو ری سائیکل کر کے پھر سے استعمال کیا جا سکتا ہے اور کون سا تقطیری آلہ کتنے میں دستیاب ہے جسے اگر آپ کچن کے نل پر فٹ کر دیں تو آپ کو اس کے ذریعے جراثیم سے پاک صحت مند پانی بہت سستے میں مل سکتا ہے۔خشک سالی کا بحران کچھ اور زیادہ ہوا تو آپ کو بڑے شہروں میں کچھ مقامات پر نمازِ استسقا کی تصاویر بھی اخبار اور ٹی وی اسکرین پر دیکھنے کو ملیں گی۔ممکن ہے کہ صوبائی اطلاعاتی محکمے یہ اشتہار بھی ایک آدھ ہفتے کے لیے چلوا دیں کہ پانی کے استعمال میں کفایت شعاری آپ کا قومی فریضہ ہے۔اور پھر جون جولائی میں مون سون آئے گا۔ہوسکتا ہے پہلے کی طرح اتنا پانی آجائے کہ اس بار بھی سنبھالا نہ جا سکے۔آخر سال میں صرف دس روز کے لیے پانی جمع کرنے کی گنجائش رکھنے والے قومی ذخائر مزید کتنے لاکھ کیوسک پانی سنبھال سکتے ہیں۔چنانچہ اس بار آنے والا سیلاب بھی سمندر خوشی خوشی جذب کر لے گا اور پھر اس پر شکر ادا کیا جائے گا کہ چلو پانی کی سطح تو نیچی ہوئی۔اور پھر الیکشن کا طوفانِ بدتمیزی شروع ہو جائے گا۔لوگ باقی سب آبی مصائب بھول بھال کر زندہ باد مردہ باد کی دھما چوکڑی میں لگ جائیں گے۔تو یہ ہے ہماری وفاقی،صوبائی اور قومی واٹر مینجمنٹ پالیسی۔

مگر میں اتنی طویل تقریرِ دل پذیر کے ذریعے آخر کہنا کیا چاہ رہا ہوں۔کچھ نہیں کہنا چاہ رہا۔بس ایک کہانی سنانا چاہ رہا ہوں۔کیپ ٹاؤن کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔اس کا شمار براعظم افریقہ کے متمول ترین شہروں میں ہوتا ہے۔جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ اسی شہر میں قائم ہے۔دنیا کے کئی ارب پتیوں نے یہاں املاک خریدی ہوئی ہیں۔نیلا بحر اوقیانوس مٹیالے بحرِ ہند سے کیپ

ٹاؤن کے کناروں پر ہی گلے ملتا ہے۔ پینتالیس لاکھ آبادی ہر جدید اور خوشحال شہر کی طرح دو طبقات میں بٹی ہوئی ہے۔ خادم اور مخدوم۔ جو مخدوم ہیں وہ بہت ہی مخدوم ہیں۔ سب کے رنگ صاف اور تمتماتے ہوئے۔ زندگی کا محور بڑے بڑے سوئمنگ پولز والے ولاز، سایہ دار گلیاں، تازہ ماڈل کی گاڑیاں، فارم ہاؤسز، کارپوریٹ بزنس اور پارٹیاں۔ شہر کے اسی فیصد آبی وسائل بیس فیصد مخدوموں کے زیرِ استعمال ہیں اور باقی اسی فیصد خدام کو بیس فیصد پانی میسر ہے۔ دس برس پہلے کچھ پاگل ماہرین نے خبردار کیا تھا کہ بڑھتی آبادی، اوورڈویلپمنٹ (اس کا اردو ترجمہ میں نہیں کرسکتا) اور ماحولیاتی تبدیلی جلد ہی کیپ ٹاؤن کو ناقابلِ رہائش بنادے گی۔ ظاہر ہے یہ وارننگ سن کر سب ہنس پڑے ہوں گے۔ اب سے تین برس پہلے تک کیپ ٹاؤن شہر کی آبی ضروریات پوری کرنے کے لیے گردونواح میں چھ ڈیموں کے ذخائر میں ہر وقت پچیس ارب گیلن پانی جمع رہتا تھا۔ امرا کو ہر ہفتے سوئمنگ پول میں پانی بدل دینے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کتوں کو بھی روزانہ دو بار پھواری غسل دینا معمول تھا۔ کار تو ظاہر ہے روزانہ دھلتی ہی ہے، باغ کو مالی پانی نہیں دے گا تو مالی کی ضرورت کیا۔ پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ خشک سالی آگئی، آبی ذخائر بھرنے والے پہاڑی، نیم پہاڑی اور میدانی نالوں کی زبانیں نکل آئیں۔ دھیرے دھیرے پچھلے برس اگست سے آبی قلت کیپ ٹاؤن کے ہر طبقے کو چبھنے لگی۔ دسمبر تک یہ آبی ایمرجنسی میں بدل گئی اور آج حالت یوں ہے کہ کیپ ٹاؤن کا حلق تر رکھنے والے چھ بڑے آبی ذخائر میں پانی کی سطح چوبیس فیصد رہ گئی۔ جب یہ دس فیصد پر پہنچ جائے گی تو پانی عملاً کیچڑ کی شکل میں ہی دستیاب ہوگا۔ چنانچہ آبی مارشل لا نافذ کرنا پڑ گیا ہے۔ جن آبی ذخائر اور نالوں میں فی الحال رمق بھر پانی موجود ہے وہاں آبی لوٹ مار، ڈکیتی، پانی کی چھینا جھپٹی اور چوری روکنے کے لیے مقامی پولیس کا اینٹی واٹر کرائم پٹرول متحرک ہے۔ غربا کو پانی کی فراہمی کے لیے دوسو ہنگامی آبی مراکز قائم کیے گئے ہیں جہاں سے پچاس لیٹر روزانہ فی کنبہ راشن حاصل کیا جاسکتا ہے (یہ

پانی آٹھ منٹ تک باتھ شاور سے گرنے والے پانی کے برابر ہے)۔سوئمنگ پول، باغبانی اور گاڑیوں کی دھلائی قابلِ دست اندازی پولیس جرم ہے۔فائیو اسٹار ریسٹورنٹس پیپر کراکری استعمال کررہے ہیں۔اچھے ہوٹلوں میں دومنٹ بعد شاور خود بخود بند ہوجاتا ہے۔یہ بحران مزید سنگین جولائی تک ہوگا جب پہلے ہفتے میں ڈے زیرو آجائے گا۔ڈے زیرو کا مطلب ہے استعمالی پانی کی نایابی۔حکومت ابھی سے ڈے زیرو سے نمٹنے کی تیاری کررہی ہے۔کیپ ٹاؤن دنیا کا پہلا ڈے زیرو شہر بننے والا ہے۔اس کے پیچھے ایک سوانیس اور شہر کھڑے ہیں۔ان میں بھارت کا آئی ٹی کیپٹل بنگلور اور پاکستان کا کراچی، لاہور اور کوئٹہ بھی شامل ہے۔آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں۔سنبھلنے کی مہلت تیزی سے کم ہورہی ہے۔

مگر جس ریاست میں میٹھے پانی کی سب سے بڑی جھیل منچھر زہر کا پیالہ بن گئی، جہاں کراچی کو پانی فراہم کرنے والی کلری جھیل کو ہالیجی سے میٹھا پانی فراہم کرنے والی نال کو آلودہ پانی لے جانے والی نہر (ایل بی او ڈی) نے کاٹ ڈالا، جہاں کوئٹہ کی ہنا جھیل سوکھے پاپڑ میں بدل گئی، جہاں دریاؤں اور سمندر کے ساحل کو خام کچرے اور صنعتی فضلے کا کوڑا گھر بنا کر اجتماعی ریپ ہورہا ہے، زہریلے پانی سے سبزیاں اگا کے انھیں فارم فریش سمجھ کے ہم اپنے بچوں کے پیٹ میں اتار رہے ہوں، میرے اپنے شہر رحیم یارخان میں زیرِ زمین پانی میں سنکھیا کی مقدار اتنی بڑھ گئی ہو کہ اب غریب لوگ نہروں سے پینے کے لیے پانی چرا رہے ہیں وہاں کیپ ٹاؤن کیا بیچتا ہے؟

حالات جس طرف جارہے ہیں اور ان کی سنگینی کا جس قدر احساس ہے اور اس احساس کو مٹانے کے لیے جس طرح ہر فورم پر بس بتایا جارہا ہے۔اس کے بعد وہ وقت دور نہیں جب کسی عدالت کا ازخود نوٹس تیرانے کے لیے بھی صاف چھوڑ گدلا پانی بھی میسر نہ ہوگا۔

وضو کو مانگ کر پانی خجل نہ کر اے میر
وہ مفلسی ہے تیمّم کو گھر میں خاک نہیں

سیداسراراحمد بخاری

نوجوانوں کے لیے ایک اہم تحریر جو بوڑھے بھی پڑھ سکتے ہیں

عزیز دوستو! اِس میں تو کوئی دورائے نہیں کہ زندگی کی سب سے بڑی عیاشی یہ ہے کہ انسان کا شوق ہی اُس کا ذریعہ معاش بن جائے، لیکن ایسا ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ بعض لوگ پیدائشی طور پر مصوری کا شوق لے کر آتے ہیں، لیکن تاعُمر کسی بینک میں کلرکی کرتے گزار دیتے ہیں، کسی کو شاعری اور ادب سے لگاؤ ہے لیکن ماں باپ نے انجینئرنگ کی تعلیم دلوادی جس کے بعد وہ نہ انجینئرنگ کے لائق رہے نہ شاعری و ادب کے۔ کسی کا ذہن مذہب و فلسفے کی پیچیدہ گُتھیوں کو با آسانی سُلجھا لینے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن معاشی فکر کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے خوف سے چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کی فیلڈ میں جا گھُسے اور فائنل اسٹیج کے پیپرز کوالیفائی کرتے کرتے بالوں میں چاندی آ گئی (جیسے کہ راقم الحروف خود)۔

صلاحیتوں اور رُجحانات میں یہ تنوع اور تقسیم درحقیقت معاشرے میں توازن پیدا کرنے کی خدائی اسکیم کا حصہ ہے۔ بدقسمتی کہیے یا حالات کا جبر، ہمارے معاشرے میں ذہین و باصلاحیت لوگوں کو اُن کے افتادِ طبع اور ذہنی رُحجان کے مطابق فیلڈز منتخب کرنے اور ایک باعزت روزگار حاصل کرنے کے مواقع میسر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو اداروں میں ایسے لوگوں کی کثرت دکھائی دے گی جو Average صلاحیتوں کے ساتھ متعلقہ ذمہ داری کو ادا کرنے میں کولہو کے بیل کی طرح جُتے ہوئے ہیں۔ وہ چونکہ کسی جبر کے تحت اس فیلڈ کا انتخاب کیے بیٹھے ہوتے ہیں، چنانچہ کام کو انجوائے کرنا کس چڑیا کا نام ہے، انہیں چنداں خبر نہیں ہوتی۔ بس نگاہ و دل گھڑی کی سوئی کے ساتھ ٹکٹکی باندھ کر جڑے رہتے ہیں کہ کب چھٹی ہو اور کب ہماری جان چھوٹے۔ قیدِ بامشقت کی صورت سارا دن کام کرنا ان کے لیے کسی آزمائش سے کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ خُود کو

کسی طرح گھسیٹ کر کام پر آمادہ کر رہے ہوتے ہیں۔

عزیز دوستو، اگر عمر قید کی اس سزا سے بچنا چاہتے ہیں تو آج اور ابھی فیصلہ کریں۔ اپنے کیرئیر کے انتخاب میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیے کہ آپ اُسی فیلڈ کو منتخب کریں جہاں آپ فطری طور پر خود کو زیادہ باصلاحیت اور ذہین محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسٹوڈنٹس سب سے زیادہ غلطی اِسی کیرئیر کے انتخاب کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ عام طور سے لوگ آپ کو ہمیشہ ایسی فیلڈ کے انتخاب کا مشورہ دیں گے جہاں پیسہ کمانے کا ''اسکوپ'' زیادہ ہے، یہی سب سے بڑی غلطی ہے۔ پیسہ کمانا یا خوب کمانا اگرچہ کوئی غلط بات نہیں، لیکن محض پیسہ ہی کمانے کی نیت سے جب آپ ایسی فیلڈ کا انتخاب کرتے ہیں جو آپ کی صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق نہیں تو پیسہ کمانے کا خواب بھی ادھورا رہتا ہے۔ کیونکہ جب تک آپ مذکورہ شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا نہیں منوا لیتے کامیابی آپ کے قدم نہیں چومتی اور لوہا منوانا صرف اندھادھند محنت ہی سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ خداداد صلاحیتیں جب محنت و ایمانداری سے تعامل کرتی ہیں تب ہی جا کر حقیقی کامیابی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات معیشت میں Macro لیول پر کسی عارضی تبدیلی یا غیر اختیاری تبدیلی کے سبب کچھ فیلڈز کے ماہرین کا ویکیوم پیدا ہو جاتا ہے اور مارکیٹ میں ان کی ضرورت بڑھ جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں اسٹوڈنٹس کی اکثریت بھیڑ چال کے مصداق اُس شعبے میں دھڑا دھڑ انرول ہو کر ڈیمانڈ سے زیادہ سپلائی پیدا کر کے اس شعبے کی مانگ مارکیٹ میں گرا دیتے ہیں۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کریں کیا؟

میرے عزیزو، سب سے پہلے تو کیرئیر کے انتخاب میں سب سے بڑا اور اہم ترین کام اپنی صلاحیتوں اور رجحان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا ہے، یعنی یہ کہ اللہ نے آپ کو کن فطری صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے۔ اس کا اندازہ کیسے ہوگا؟ دیکھیے، ہر انسان ہر شعبے کے لیے موزوں ہو، یہ ممکن

نہیں ہے۔ اب آپ نے کیسے اندازہ لگانا ہے کہ آپ میں اللہ رب العزت نے کون سی فطری خوبیاں اور ٹیلنٹ دے کر بھیجا ہے تو اٹھائیے کاغذ قلم اور نوٹ کیجیے۔

سب سے پہلی چیز ہے بورڈم یعنی "بوریت" کا احساس، یہ بوریت کا احساس بھی ایک بڑی نعمت ہے جو خدا کی طرف سے ایک بہترین خودکار الارم کے طور پر ہمارے اندر فٹ کر دیا گیا ہے۔ آپ جس کام کے لیے پیدا نہیں کیے گئے آپ کو وہ کام کرتے ہوئے اندر ہی اندر اکتاہٹ اور بوریت کا احساس ہوگا اور آپ محسوس کریں گے کہ یہ جگہ اور یہ کام میرے لیے نہیں ہے۔

میں کسی اور ہی دیس کا باسی، کسی اور ہی میدان کا کھلاڑی ہوں۔ چنانچہ نوٹ کر لیجیے۔

نمبر ۱۔ جس شعبے یا کام کے آپ ماہر اور کامیاب فرد بن سکتے ہیں اس کام کو کرتے وقت آپ محسوس کریں گے کہ آپ کو بوریت یا اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوگا۔

نمبر ۲۔ اُس کام کو کرتے ہوئے تھکن کا احساس کم سے کم ہوگا، بلکہ یہ تک احساس نہیں ہوگا کہ دن کب گزرا اور رات کب آئی۔

نمبر ۳۔ اس شعبے کی معلومات نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کو مل جایا کریں گی۔

نمبر ۴۔ آپ کا بڑے سے بڑا ناقد بھی اس شعبے سے متعلق آپ کی صلاحیت کا اعتراف کرے گا۔

نمبر ۵۔ اس کام کو کرنے کے لیے آپ کو معاوضے کی کوئی فکر نہیں ہوگی۔

خودشناسی سب سے بڑا انسانی جوہر ہے، یہ پانچ باتیں جس کام یا شعبے سے متعلق آپ میں موجود ہوں۔ سمجھ لیجیے، اللہ رب العزت نے آپ کو اسی کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہاں آپ کو کامیابی تلاش نہیں کرنی پڑے گی بلکہ یہاں آپ قدرت کی طرف سے کامیاب ہی پیدا کیے گئے ہیں۔ اب صرف اس رستے پر چلنا شروع کرنا ہے۔

بسم اللہ کیجیے اور جھونک دیجیے خود کو اسی فیلڈ میں، اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔!

رضوان خالد چوھدری

صُوفی ہچ ہائیکر......

کچھ عرصہ قبل کسی کام سے بائی روڈ لندن اونٹیریو جانا ہوا۔ میں نے راستے میں ہائی وے پر ایک ادھیڑ عمر ہِچ ہائیکر کو دیکھا جو ''لفٹ چاہیے'' کا ہاتھ سے لکھا پوسٹر اُٹھائے کھڑا سردی سے کانپ رہا تھا۔ شدید بارش ہورہی تھی، میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی گاڑی روک کر اُسے بٹھالیا۔ اس سے گفتگو شروع ہوتے ہی مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ٹھیک ٹھاک تعلیم یافتہ تھا۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ اسے کوئی مرض لاحق تھا جس کی وجہ سے وہ بات کرتے کرتے بھول جاتا تھا کہ کس موضوع پر بات ہورہی تھی۔ لیکن دوسری طرف اس کی یاداشت اتنی اچھی تھی کہ بات کرتے وقت موضوع کی مناسبت سے مختلف سکالرز کے لکھے ہوئے پیراگرافس لفظ بلفظ بیان کررہا تھا۔ پہلے آپ کو یہ بتا دوں کہ ہچ ہائکرز کہتے کن لوگوں کو ہیں، پھر اصل بات کی طرف آتے ہیں۔

ہِچ ہائکرز بے گھر ہوتے ہیں، ایک سے زیادہ دن ایک شہر میں نہیں گزارتے اور ہمیشہ لفٹ لے کر سفر کرتے ہیں۔ جس شہر کے لیے لفٹ مل جائے وہی شہر اگلے چوبیس گھنٹے کے لیے ان کی منزل ہوتی ہے۔ یہ ہر شہر میں بے گھر لوگوں کے لیے بنے سرکاری سینٹرز میں کھانا کھاتے ہیں، وہیں غسل کرتے، کپڑے دھوتے اور سو جاتے ہیں اور صبح اُٹھ کر پھر سفر شروع کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو حکُومت کی طرف سے مختصر سا الاؤنس ملتا ہے جو یہ اپنی اضافی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

مجھ سے لفٹ لینے والے ہچ ہائیکر نے بتایا کہ وہ تیرہ سال ایک یونیورسٹی میں نابینا سٹوڈنٹس کے لیے کتابیں پڑھ کر ریکارڈنگ کرنے کی نوکری کرتا رہا۔ لیکن ایمنیز یا کا مرض بڑھنے کی وجہ سے اُسے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ مل گئی اور اس نے اولڈ ہوم میں جانے کی بجائے ہچ ہائکر

بننے کا فیصلہ کیا۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ ایک ہفتے میں تین کتابیں ریکارڈ کرلیا کرتا تھا۔ وہ اپنے کام کے بارے میں نہ بھی بتاتا تب بھی اُس کے بولے ہوئے ہر فقرے سے ہزاروں کتابوں کا قاری ہونے کا ثبوت تو مل رہا تھا۔ چار گھنٹے کے سفر میں اس سے ادیانِ عالم، کائنات، ثقافت اور زندگی کے مقصد سمیت کئی موضوعات پر بات ہوئی۔ گوکہ چند منٹ ایک موضوع پر بات کرتے ہی وہ بھول جاتا تھا کہ موضوع گفتگو کیا تھا اور ساتھ ہی کوئی نیا موضُوع شروع ہو جاتا، البتّہ اس سے جس جس موضوع پر جتنی بھی بات ہوئی اس کے علم اور مُدلّل اندازِ گفتگو پر میں رشک میں مبتلا ہوتا گیا۔ وہ ایک سانس میں اپنی کسی بات کی دلیل کے لیے یونانی فلاسفرز کا حوالہ دیتا، دوسری میں مسلم سکالرز کا اور تیسری میں قُرونِ اُولیٰ کے ہندو فلسفیوں کی کہی ہوئی کسی بات سے اپنی بات کو تقویّت دیتا اور اس دوران بھول بھی جاتا کہ بات کس ٹاپک پر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہونے والی بہت سی باتوں میں سے میں چند آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔

باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم سے کہنے لگا، تمہیں معلوم ہے تم اس روڈ سے کیوں گزرے جہاں میں کھڑا تھا۔ میں نے کہا کیونکہ مجھے لندن جانا تھا۔

ہاں، وہ تو تمہیں جانا ہی تھا، وہ بولنا شروع ہوا۔ لیکن تم اس خاص وقت میں وہاں سے اس لیے گزرے کہ وہاں تمہارے لیے قدرت نے ایک امتحان رکھا تھا۔ اگر تم اس امتحان میں ناکام ہوتے تب بھی مجھے لفٹ ضرور مل جاتی، کیونکہ قدرت بیک وقت کئی متبادل اسباب کا بندوبست کرتی ہے۔ لیکن تمہیں اس ناکامی کے بعد اگلا امتحان اس سے مشکل ملنا تھا۔ خود کو انسانیت کے لیے مفید ثابت کرنے کے جتنے مواقع ضائع کیے جائیں، مفید بننا اتنا ہی مشکل ہوتا جائے گا۔ وہ بولتا چلا گیا۔

اس نے مزید کہا کہ میں پندرہ منٹ پہلے اس روڈ پر آ کر کھڑا ہوا تھا اور تم سے پہلے کئی گاڑیاں وہاں سے گزریں۔ میرا تو کام ہی انتظار کرنا ہے۔ میرے سفر کا بندوبست کرنا تو قدرت کا کام ہے لوگوں کا نہیں، مجھے دکھ ان لوگوں کی ناکامی پر ہوتا ہے جو امتحان کے ہر سوال کو برابری کی بنیاد پر سنجیدہ نہیں لیتے۔ کسی کو یاد ہی نہیں کہ زندگی تو بس ایک امتحان ہے اور قدم قدم پر قدرت کے امتحان کے سوالنامے رکھے ہیں۔

میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا جب وہ بات کرتے کرتے پھر بھول گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ میں نے اسے الجھن میں دیکھ کر ٹاپک بدلنے کے لیے پوچھا: ابھی تو شاید تم پچاس کے بھی نہیں ہو، اتنے تعلیم یافتہ بھی ہو، پھر کیوں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہو؟ تمہیں اپنی بیماری کے باوجود اچھی جاب مل سکتی ہے۔

اس کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ اسے مجھ سے اس احمقانہ سوال کی توقع نہیں تھی۔ کہنے لگا: دیکھو، مجھے گورنمنٹ سے نوسو ڈالر ماہانہ ملتے ہیں جو بھیک نہیں، وقت سے پہلے ملنے والی ریٹائرمنٹ کی پنشن ہے۔ اگر تم غور کرو تو جان سکتے ہو کہ ان پیسوں سے میں با آسانی ریٹائرمنٹ ہوم میں آسائش کے ساتھ رہ سکتا ہوں لیکن پھر نہ تو خدا کو اپنی طرف متوجّہ کر سکوں گا نہ میں خود خدا کو دیکھ سکوں گا۔

میں نے پوچھا: تم خدا کو کیسے دیکھتے ہو اور کیسے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہو؟ وہ بولا: اپنے اور دوسروں کے لیے قدم قدم پر اس کے بچھائے ہوئے امتحان اور بندوبست میں اسے دیکھتا ہوں اور ضرورت مندوں کی مدد کر کے اسے اپنی طرف متوجہ کرتا ہوں۔

میں نے سوچا جو خود بے گھر ہے اور سفر کے لیے لفٹ کا محتاج ہے وہ کیا کسی کی مدد کرے گا۔ لیکن میں نے گفتگو آگے بڑھانے کو پوچھا: تمہارا تو اب کوئی خرچہ ہی نہیں ہے پھر تم اس پنشن

کا کیا کرتے ہو جو تمہیں ملتی ہے؟

خیرات کرتا ہوں...... وہ بولا۔ اور ساتھ ہی اپنے بیگ کی ایک جیب سے پلان کینیڈا نامی ایک خیراتی ادارے کو دی گئی امداد کے ایگریمنٹس نکال کر مجھے دکھانے لگا۔ ایگریمینٹس اور رسیدوں کے مطابق وہ بندہ خُدا افریقہ میں تین یتیم بچیوں کا فوسٹر فادر یعنی نگہبان تھا۔ اور ان کی تعلیم اور ہاسٹل کے اخراجات کی مد میں سات سو تیس ڈالر ماہانہ پلان کینیڈا کو ادا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بیماری کی وجہ سے ایسا بندوبست کیا ہوا تھا کہ یہ پیسے ہر ماہ اس کے اکاؤنٹ سے خود نکل جائیں۔ میں نے اس کے کاغذات اُسے واپس کیے اور پوچھا یہ تم کب سے کر رہے ہو؟

تب تک وہ پچھلی ساری بات بھول چکا تھا۔ پوچھنے لگا: کیا کب سے کر رہا ہوں؟ میں نے سوال بدلتے ہوئے پوچھا: ہم زندگی کے مقصد پر بات کر رہے تھے۔ تم یہ بتاؤ، یہ زندگی کس بات کا امتحان ہے؟

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا: جب خدا ہمیں دوبارہ اُٹھائے گا تب ہی حقیقی زندگی شروع ہوگی۔ اور اس زندگی میں مراعات اس بنیاد پر ملیں گی کہ ہم دنیاوی زندگی میں انسانوں کے لیے کتنے مفید تھے اور یہی خلاصہ کلام ہے کہ یہ زندگی خود کو انسانوں کے لیے مفید ثابت کرنے اور شکر گزار رہنے کا امتحان ہے۔

میں نے کہا: یار! تم اتنے سمجھدار ہو تمہیں قرآن بھی سٹڈی کرنا چاہیے۔ جواب میں اُس نے سورہ نور کی اللہ سے متعلق ایک بڑی آیت کی انگلش ٹرانسلیشن مجھے اس انداز میں سنائی کہ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ساتھ ہی اس نے اپنے بیگ سے قرآن کی ایک بوسیدہ سی کاپی نکال کر مجھے دکھائی تو میں نے اسے کہا کہ میرے پاس قرآن کی نئی کاپی ہے تم وہ لے کر یہ مجھے دے دو۔ وہ بولا کہ نہیں، اس پر میں نے جگہ جگہ اپنے نوٹس لکھے ہوئے ہیں۔

میں نے گاڑی ایک کافی شاپ پر روکی اور دونوں کے لیے ناشتہ لینے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس نے میری گاڑی کی صفائی کرنے کے بعد اندر باہر سے چمکائی ہوئی تھی اور بونٹ کھولے سکرین صاف کرنے والا واشر لیکوُ یئڈ اس کی مخصوص ٹینکی میں ڈال رہا تھا۔ میں نے پوچھا، یہ تم نے کہاں سے لیا۔ اس نے سامنے گیس سٹیشن کی طرف اشارہ کر کے کہا: وہاں سے لیا ہے۔ تمہاری گاڑی میں واشر لیکوُ یئڈ والی ٹینکی خالی تھی، اس موسم میں یہ ٹینکی بھری ہوئی ہونی چاہیے۔

میں نے واشر لیکوُ یئڈ کے پیسے دینا چاہے اُس نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ جو ناشتہ تم میرے لیے لائے ہو یہ اُس سے سستا ہے۔

اس سے ہونے والی گفتگو کا پانچ فیصد بھی میں لکھ نہیں پایا۔ وہ تو لندن پہنچ کر میری گاڑی سے اُتر گیا لیکن میں شاید لمبے عرصے تک اس انسان کو نہ بھُول پاؤں۔ واپس آ کر اپنے دوستوں سے اس کا تذکرہ میں نے صُوفی ہچ ہائیکر کے نام سے کیا۔

شفقت علی

گلاب کا پیغام

ہر باذوق انسان پھولوں کو پسند کرتا ہے۔ پھول ایک طرف گھر کی آرائش وزیبائش کا کام دیتے ہیں تو دوسری طرف انسانوں میں انس ومحبت کے اظہار کے لیے تحفہ کا بھی۔ خوشی کا تہوار ہو کہ غم کی رسومات، پھول ہر موقع پر موجود ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ پھولوں کا ہماری زندگی میں استعمال بہت ہے۔

پھولوں کی کئی اقسام ہیں مگر ان سب میں گلاب کا پھول بہت مقبولیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے پھولوں کا بادشاہ بھی کہا جاتا ہے۔ گلاب کی بھی کئی اقسام اور رنگ ہیں مگر ایک بات جو ہر قسم کے گلاب کے پھول میں یکساں ہے، وہ ہے اس کے پھول کے ساتھ کانٹے کا ہونا اور خوشبو کے ساتھ چُبھن کا ہونا۔

گلاب کا پھول بظاہر ہمارے ذوقِ جمالیات کی تسکین کرتا ہے مگر ساتھ میں یہ ہمیں کئی خاموش پیغام بھی دے رہا ہوتا ہے جسے صرف وہی لوگ سن پاتے ہیں جو غور وفکر کا مزاج رکھتے ہوں۔ اسی طرح توسّم کے فن سے واقف لوگ، یعنی مادی اشیاء اور واقعات سے سبق لینے والے، ہی گلاب کے پھول سے کامیاب زندگی گزارنے کے رہنما اصول سیکھ پاتے ہیں۔

پہلا خاموش پیغام جو ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے حالات بھی گلاب کے پھول کی طرح ہیں۔ یعنی یہاں خوشبو جیسی خوشگواری بھی ہے اور کانٹوں کی سی ناخوشگواری بھی۔ یہاں نرم پتّیوں جیسی آسائشیں بھی ہیں اور نوکیلے کانٹوں کی مانند تکالیف بھی۔ پس جس طرح ہم گلاب کے پھول کو کانٹوں سمیت قبول کر لیتے ہیں ہمیں اس دنیا کو بھی تکالیف سمیت قبول کر لینا چاہیے۔

دوسرا خاموش پیغام یہ ہے کہ یہاں انسان بھی گلاب کے مِثل دو خصوصیات رکھتے ہیں۔

یعنی ہر انسان میں نرم پتیوں اور خوشبو کی طرح خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کانٹوں کی طرح خامیاں بھی۔ کوئی بھی انسان صرف ایک طرح کی خصوصیات نہیں رکھتا۔ لہٰذا ہمیں انسانوں کی صرف خوبیوں پر نظر رکھنی چاہیے اور خامیوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے جیسا کہ ہم گلاب کے پھول میں صرف پھول اور خوشبو پہ نظر رکھتے ہیں اور کانٹے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

تیسرا خاموش پیغام یہ ہے کہ ہر انسان کی شخصیّت میں گلاب کے پھول کی طرح دو حصّے ہوتے ہیں۔ پہلا حصّہ نرم پتیوں کے جیسا نرم ہوتا ہے جسے ضمیر کہتے ہیں اور دوسرا حصّہ کانٹے کے جیسا نوکیلا ہوتا ہے جسے انا کہتے ہیں۔ ہمارا عام تجربہ ہے کہ اگر ہم گلاب کی پتیوں کو چھوئیں تو ملائمت کا احساس ہوتا ہے جبکہ کانٹے کو چھونے سے چبھن کا۔ بالکل اسی طرح اگر ہم انسان کے ضمیر کو مخاطب کریں گے تو ہمیں اگلے انسان سے جواب میں نرم رویہ ملے گا جبکہ اس کے برعکس اگر اس کی انا کو چھیڑیں گے تو جوابی رویہ کانٹے کی طرح تکلیف دہ ہی ہوگا۔

فرح رضوان

تربیت (میری ڈائری سے ماخوذ ایک صفحہ)

آیہ صفا کی ڈیڑھ سالہ چھوٹی بہن ہیں۔ بے حد لاڈلی، گویا دنیا میں لوگ موجود ہی ان کو پروٹوکول دینے ،لاڈ اٹھانے کے لیے ہوں، جوان کے مسخرے پن پر ہنسیں لیکن کارستانیوں پر آنکھیں بند رکھیں، ڈسپلن کا پابند نہ کریں کیونکہ اس سے وہ بہت دُکھی ہو جاتی ہیں۔

میں کچن کے کاموں سے نمٹ کر پانی پینے بیٹھی تو پہلے ہی گھونٹ پر سامنے متصل فیملی روم کے فائرپلیس کے شیشے پر نگاہ ٹک کر رہ گئی، جس پر آیہ کے ننھے منے گندے سنے ہوئے ہاتھوں کے نشان جا بجا دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر دھبے صاف کر دیے۔ کہانی ختم۔

ارے ٹھہریے، یاد ہے نا! پہلے گھونٹ پر یہ سب دکھائی دیا تھا تو میں بڑے والے گلاس میں پانی پی رہی تھی، پانی ختم ہونے تک کتنے ہی منظر ذہن سے گزر گئے یہ بتانا تو ابھی باقی ہے نا!۔

مجھے پتہ نہیں تھا گذرتے وقت کے ساتھ الحمدللہ میں فل ٹائم نانو بن جاؤں گی، لیکن اب سوچتی ہوں کہ یہ کام جواب بچوں کے بچوں کے لئے ہورہا ہے، اپنے ذاتی بچوں کے لیے بھی ہو سکتا تھا۔ (آپ اپنے بچوں کے لیے کر سکیں تو ضرور کریں۔)

میں الحمدللہ اپنی زندگی میں کسی بھی حکمت عملی کے جو بھی اچھے نتائج آج دیکھتی ہوں، اُس میں کہیں نہ کہیں امی کی مسلسل نصیحت یاد آتی ہے۔ ''اتنی صفائی! اتنی صفائی سے کیا کر لوگی بھلا؟ بچوں کی تربیت پر جان مارنے کا وقت کہاں بچے گا؟ یہ کوئی بچوں پر ناراض ہونے کی باتیں ہیں، ان ذرا ذرا سی سطحی باتوں پر ناراضی دکھاتی رہی تو بڑے ہونے پر جب بچے مونہہ زور ہونے لگیں گے کس طرح، کس لہجے میں، کتنی اونچی آواز میں بات کروگی؟

کچھ مائیں سلیقے سے نہ رہنے پر ڈانٹا کرتی ہیں، ہماری امی '' سلیقہ مندی '' پر ڈانٹتیں۔ آج

جتنا شکر کروں کم ہے کہ ہر بات میں اعتدال ہی بھلا ہوتا ہے، عمر گذرتے لوگوں کو گھر کی انتہا درجے صفائی میں کھپتے، گھلتے، کڑھتے، کوستے، اور جھگڑتے دیکھا ہے، اسی سے عشق، اسی کے ارد گرد باتیں، شکوے، پلاننگ اور کچھ بھی نہیں۔ لڑکوں کی ماؤں کو دیکھا کہ ان کے لڑکے سارا سارا دن باہر رہیں تو گھر صاف رہتا ہے، (باہر ان کی صحبت اور صحت صاف ہو یا نہ ہو، اس کی پروا نہیں)۔ جبکہ لڑکیوں کی مائیں صفائی کی خواہش میں اول تو ان کا اور اپنا جینا دوبھر کرتی ہی ہیں، لیکن صفائی جہاں نصف ایمان سے تجاوز کر کے خبط میں داخل ہو جائے وہاں لڑکیوں کا دوسرے گھر جا کر نباہ کرنا بھی مشکل ہونے لگتا ہے۔ (لہٰذا ہمیشہ میانہ روی یا اعتدال کی راہ اپناتے ہوئے اولاد کی تربیت کی جائے۔)

جو لوگ انتہائی سلیقے کے عادی ہوتے ہیں، ان کے لیے عموماً خوشی کا وقت خاصہ مختصر ہوتا ہے، مگر اسے شکر سے کافی زیادہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ بے ترتیبی دیکھ کر غصہ تو آتا ہے لیکن شکر کا مقام بھی اسی کو بنالیں، گھر والے ہیں، تب ہی تو زندگی کے آثار ہیں، شکر ہے صحت مند ہیں، خود سے کھا پی سکتے ہیں۔ کوئی بات نہیں ''ذرا سے'' برتن بکھرے ہیں تو کیا ہوا، اللہ نے رزق دیا ہوا ہے۔ گھر بکھرا دکھائی دے رہا ہے تو کیوں؟ کیونکہ ہماری بینائی جیسی نعمت سلامت ہے، اور اس گندگی سے کوفت بھی نعمت ہے کہ ہر بندے کو یہ نفاست نہیں ملتی۔ پھر سے گھر صاف کرنا پڑے گا، تو الحمدللہ چلتے پھرتے ہاتھ پیر کی نعمت موجود ہے (سو بہتر ہے کہ مسائل کو دیکھ کر کڑھنے کے بجائے دی گئی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے ان کا حل سوچا جائے۔)

ان سبھی باتوں کو سوچتے آدھا گلاس پانی ختم ہو چکا تھا، آدھا ابھی باقی ہے۔

فائر پلیس کے شیشے پر گندے ہاتھوں کے نشان دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس تک معصوم بچوں کی رسائی کیوں کر ہو سکی۔ ڈنر کے وقت کسی نے روکا نہیں، کوئی آڑ یا کوئی رکاوٹ نہیں لگائی،

اور تب یاد آیا کہ بچوں ہی کی وجہ سے کچھ روز قبل اس آتشدان کا ننھا سا فلیم/ پائلٹ بند کر دیا گیا تھا، تب ہی تو سب بے فکر تھے، کوئی روک نہیں لگائی تھی اور اتنے عرصے میں پہلی بار فائر پلیس کے شیشے کا بالکل وہی حال ہوا تھا جو اب ہماری دنیا کا ہو چکا ہے۔

اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ہمیں اپنی ذمہ داریاں یا فرائض پورے کرنے کی عادت نہیں رہی۔ اولاد کی تربیت نسلوں کی تعمیر کا سنگ بنیاد ہے، اس سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ اللہ کی رحمت اپنی جگہ لیکن خدا خوفی سے کسی نہ کسی حد تک بڑے ہوتے بچوں کو بھی آشنا کروا کر ان کی حدود متعین کرنی چاہئیں۔ اور سب سے بڑھ کر خود اپنی، ورنہ ہماری ذات، ہمارا ماحول، ہمارا معاشرہ، ہمارا مستقبل میلے سنے ہاتھوں سے محفوظ کیسے رہ پائے گا؟

سخت روزے کے بعد افطار کی نعمت
دنیا کی پابند زندگی کے بعد
جنت کی پر لذت زندگی کا ایسا تعارف ہے
جو صرف روزے دار کو نصیب ہوتا ہے

زندگی میں پیش آنے والے ناگوار حالات
روزے دار کے ایک سخت دن کی طرح
آخر کار گزر جاتے ہیں
یہی رمضان کا اصل سبق ہے

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (49)

حقوق باری تعالیٰ: عبادت رب

ہم نے پیچھے یہ بیان کیا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے حوالے سے عائد کردہ پہلا اور بنیادی مطالبہ شرک سے پرہیز ہے۔ شرک کا عملی ظہور غیر اللہ کی عبادت اور پرستش کی شکل میں ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ دینی مطالبات بیان کرتے ہوئے شرک سے روکتے ہیں تو ساتھ ہی ایک اللہ کی عبادت یعنی اس کی بندگی کا حکم دیتے ہیں۔

''اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔''، (النساء 4 :36)

خدا کی عبادت یا بندگی ایک جامع اصطلاح ہے۔ لغوی طور پر اس کی اصل عاجزی اور پستی ہے۔ یہ عاجزی اور پستی قلب پر طاری ہو جانے والی وہ کیفیت ہے جس میں انسان معبود کی عظمت، قدرت اور طاقت سے مرعوب ہو کر خود کو اس کا ایک عاجز بندہ اور بے کس غلام سمجھ کر زندگی گزارتا ہے۔ عبد و معبود کے اس تعلق کا پہلا ظہور پرستش ہے جس کی کامل ترین شکل نماز ہے۔ چنانچہ یہی وہ پس منظر ہے جس میں نماز کے اندر خشوع یعنی عاجزی کے اظہار کو ایک دینی مطالبے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ارشادی باری تعالیٰ ہے:

''جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔''، (مومنون 23 :2)

یہ خشیت قلبی جس کا اظہار نماز کے موقع پر ہوتا ہے، اہل ایمان کا ایک مستقل وصف ہے جو انھیں فکر و عقیدے کی ہر آلائش سے بچا کر بندوں کے حقوق کے معاملے میں حساس بنا دیتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مالک کے حکم پر اس کے بندوں پر خرچ کرتے ہیں مگر اللہ کی راہ میں خرچ کر کے بھی اس کے محاسبہ کے خیال سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

''بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی خشیت سے ہر وقت ترساں ہیں۔اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں۔اور وہ لوگ جو اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرے ہوئے رہتے ہیں کہ انھیں خدا کی طرف پلٹنا ہے۔''،(مومنون23 :60-57)

تاہم خدا خوفی کا یہ احساس کوئی منفی جذبہ نہیں جو کسی جابر کے خوف سے پیدا ہوتا ہو بلکہ یہ ایک کریم ہستی کی نظر کرم سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہے جس نے بندوں کو ان گنت نعمتیں دے رکھی ہیں۔اور جس کی ناراضی کا مطلب دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں سے محروم ہو جانا ہے۔ چنانچہ خدا کا یہ خوف، طمع سے پیدا ہوتا ہے اور تمام مظاہر عبودیت اسی خوف و طمع کا ظہور ہیں۔

یہی خوف و طمع ہے جو بندہ مومن کو معبود کا پیغام اور اس کی نشانیاں سامنے آنے پر اس کے حضور سجدہ ریز ہونے ،اس کی تسبیح و تعریف کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ایسے انسان کے دل سے اپنی بڑائی کا ہر شائبہ نکل جاتا ہے۔وہ اس کی بندگی کے لیے اتنا حساس ہو جاتا ہے کہ رات کے وقت اپنا راحت بھرا بستر چھوڑ کر اس کی عبادت کے لیے اٹھتا ہے اور طمع و خوف کے ساتھ اسے ہی پکارتا ہے۔ایسا انسان اپنا ہر گروہی تعصب چھوڑ کر حق کے اعتراف میں بے تابانہ روتے ہوئے زمین بوس ہو جاتا ہے۔ یہ ان کا خشوع ہی ہوتا ہے جو انھیں اعتراف حق پر مجبور کرتا ہے اور سچائی کا سامنے آنا ان کے اندر خدا کی عظمت کے احساس کو اور بڑھا دیتا ہے۔

''ہماری آیات پر تو بس وہی لوگ ایمان لاتے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے ذریعہ سے ان کو یاددہانی کی جاتی ہے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ان کے پہلو بستروں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف اور طمع سے اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''،(سجدہ32 :16-15)

''ان سے کہہ دو کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، وہ لوگ جن کو اس کے پہلے سے علم ملا ہوا ہے جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ پاک

ہے ہمارا پروردگار، بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ شدنی تھا۔‘‘ (بنی اسرائیل 17:108-107)

خدا کی یہ عبادت جو ایک قلبی کیفیت سے آگے بڑھ کر بندگی کے ان مظاہر میں ڈھلتی ہے جنھیں مراسم عبودیت یا پرستش کہا جاتا ہے اور جن کی نمایاں مثالیں تسبیح و تمجید، دعا و زاری، رکوع وسجود اور انفاق وغیرہ کی شکل میں اوپر بیان ہوئیں، جب انسان کے عملی وجود سے متعلق ہوتی ہے تو اسے مجبور کرتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں جہاں اس کے مالک کا حکم آجائے، اس کی اطاعت کرتے ہوئے اس کے سامنے سر اطاعت ختم کر دے۔ ارشادی باری تعالیٰ ہے۔

’’اہل کتاب کھلی ہوئی نشانی آجانے کے بعد ہی اختلاف میں پڑے۔ ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اپنی اطاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے، بالکل یکسو ہو کر اور نماز کا اہتمام رکھیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سیدھی ملت کا دین ہے۔‘‘ (البینہ 98: 5-4)

’’تم اللہ ہی کی بندگی کرو، اپنی اطاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ یاد رکھو کہ خالص اطاعت اللہ ہی کے لیے ہے۔‘‘ (الزمر 39: 3-2)

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ عبادت ایک قلبی کیفیت ہے جس میں انسان ایک عظیم ہستی کی قدرتِ کاملہ کے سامنے اپنے عجز مطلق کو دریافت کرتا ہے۔ پھر خوف و طمع کے ساتھ اسے پکارتا، مراسم عبودیت بجالاتا اور عملی زندگی کے ہر شعبے میں اسی کی اطاعت کرتا ہے۔

بندگی کی یہ سوچ جو انسان کے قلب و ذہن کا احاطہ کر لے، اس کے مراسم عبودیت کو تنہا رب رحمٰن کے لیے خاص کر دے اور اس کی عملی اور دنیوی زندگی کو بھی خدا کی فرمانبرداری کے سانچے میں ڈھال دے، شرک سے بچنے کے ساتھ دین کا وہ بنیادی مطالبہ ہے جو حقوق رب کے ضمن میں قرآن مجید سے سامنے آتا ہے۔ یہی وہ دینی مطالبہ ہے جو تمام دینی احکام کا اصل ماخذ اور مقصدِ تخلیق ہے:

’’اور جنوں اور انسانوں کو میں نے صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔‘‘ (الذاریات 51:56)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (53)

ڈاکٹر شعبان نے اتنے اچھے طریقے سے دیانت کے دفتر کا پتہ بتایا کہ ہم بغیر کسی غلطی کے سیدھے وہاں جا پہنچے۔ یہ دفتر انقرہ سے ''اسکی شہر'' جانے والی سڑک پر واقع تھا۔ گیٹ پر موجود سکیورٹی گارڈز کو نجانے میری شکل پر کیا نظر آیا کہ انہوں نے بغیر کچھ پوچھے گیٹ کھول دیا۔ ایک نہایت ہی پر شکوہ دس منزلہ عمارت ہماری نگاہوں کے سامنے تھی جس کی وسیع و عریض پارکنگ کسی باغ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہر طرف پھول ہی پھول نظر آ رہے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ''دیانت'' ترکی کی حکومت کا ایک ادارہ ہے۔ اس ادارے کا مقصد ترکی کے مذہبی امور کی ایڈمنسٹریشن ہے۔

میں نے یہاں بھی ریسپشن پر وہی نسخہ آزمایا کہ کسی انگریزی بولنے والے اسکالر سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ایک صاحب احمد ساجندی سے کال ملا دی۔ میں نے ان سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ بولے: ''آپ وہیں ٹھہریے، میں نیچے آ رہا ہوں۔'' اس کے بعد یہ صاحب مجھے اپنے دفتر میں لے گئے۔ تھوڑی دیر میں ان کے ایک اور کولیگ اردال عطالائی بھی آ گئے۔ ان دونوں نے کافی کوشش کی کہ حدیث پراجیکٹ پر کام کرنے والے کسی اسکالر سے ملاقات کا بندوبست کیا جائے مگر بدقسمتی سے وہاں کوئی دستیاب نہ تھا۔ میں نے ان سے دیانت کے کام کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کافی تفصیلات فراہم کیں۔

انہوں نے بتایا یہ ادارہ نہ صرف ترکی بلکہ یورپ کے مختلف ممالک بالخصوص جرمنی میں موجود مساجد کا انتظام کرتا ہے۔ ان کے زیر انتظام اندرون و بیرون ملک مساجد کی تعداد 75000 سے زائد ہے۔ ان مساجد کے ائمہ کی تنخواہیں ترکی کی حکومت ادا کرتی ہے۔ ان مساجد کے ذریعے دین کی دعوت کا کام پورے یورپ میں جاری ہے۔ سیکولر ترکی کا یہ روپ میرے لئے نیا تھا۔ انہوں نے مجھے دیانت سے متعلق کچھ بروشر بھی دیے۔

ان بروشرز میں دی گئی معلومات کے مطابق دیانت کوئی تھیوکریٹک ادارہ نہیں ہے۔ یہ محض ایک انتظامی نوعیت کا ادارہ ہے جس کا کام مساجد کا انتظام وانصرام ہے۔ ترکی کے اہل علم کو اظہار رائے کی مکمل آزادی حاصل ہے اور اس کام میں حکومت مداخلت نہیں کرتی۔ دیانت کا ادارہ یونیورسٹیوں کی فیکلٹی آف ڈیوائنٹی کی مدد سے مختلف تحقیقی پراجیکٹس کا اہتمام کرتی ہے تاکہ عوام کو صحیح علم فراہم کیا جا سکے۔ بین الاقوامی سطح پر یہ ادارہ دوسرے مذاہب کے اداروں کے ساتھ مل کر ورکشاپس اور کانفرنسز کا اہتمام کرتا ہے تاکہ مذاہب کے درمیان مثبت مکالمے کو فروغ دیا جا سکے۔

دیانت کے موجودہ سربراہ ڈاکٹر علی بارداکوغلو ہیں۔ احمد نے مجھے ان کی ایک کتاب Religion and Society: New Perspectives from Turkey بھی دی۔ بعد میں میں نے یہ کتاب پڑھی تو بہت دلچسپ محسوس ہوئی۔ قارئین کے لئے ان کی کتاب کے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں تاکہ ان کے خیالات سے ہم بھی آگاہ ہو سکیں۔ صحیح دینی علم کی اہمیت سے متعلق لکھتے ہیں:

اسلام کی روایت میں اہل علم نے معاشرتی انضباط، قومی استحکام اور رائے عامہ کو تیار کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ علم سوسائٹی کی بنیاد میں شامل ہے۔ اس وجہ سے ایک حقیقی مسلم معاشرہ وہ ہے جو کہ صحیح علم پیدا کرے۔ غلط فہمیوں کو مسترد کرے اور علم کو قوت کے طور پر تیار کرے۔۔۔۔

صحیح علم کا مطلب ہے کہ توہم پرستی، غلطی، جہالت، بے انصافی اور مذہب کے غلط استعمال کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ اسلامی روایت میں، یہ مذہبی علماء ہی ہیں جنھوں نے بے انصافی، توہم پرستی، مذہب کے غلط استعمال اور انتہا پسندی کے خلاف جہاد جاری رکھا ہے۔ مذہبی علم اپنی حقیقت کے اندر ایک جدوجہد کا نام ہے۔ اپنے معاملات کو مضبوط مذہبی علم کی بنیاد پر قائم رکھتے ہوئے، ادارہ مذہبی امور (دیانت) انتہا پسندانہ رجحانات کو برداشت نہیں کرتا جو کہ سماجی امن کو نقصان پہنچائیں۔ جن لوگوں میں یہ رجحان پائے جائیں، انہیں درست معلومات فراہم کی جاتی

ہیں، انہیں تعلیم دی جاتی ہے اور (انتہا پسندی ترک کرنے کے لئے) انہیں قائل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک پرخطر راستہ ہے۔ ایسی مذہبیت جو کہ علم کے بجائے جذبات کی بنیاد پر قائم ہو، بالعموم معاشرے سے کٹ کر رہ جاتی ہے۔ ایسے افراد جنھوں نے جذباتی ماحول میں خود کو کسی خاص قوت، تحریک یا مرکز کے سامنے سرنگوں کر دیا ہو، ان کے ذہنوں کو روشن کرنا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔۔۔۔

ڈاکٹر علی بردا کوغلو سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کو استعمال کرنے کے شدید ناقد ہیں۔ اس سے متعلق لکھتے ہیں:

ہم یہ دعوی تو نہیں کرتے کہ تشدد، ٹینشن اور بے امنی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ہمیں دو بنیادی غلطیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ پہلی تو یہ کہ مذہبی تعلیم و تربیت کی عدم فراہمی کے سنگین نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں معاشرتی ترقی میں مذہب کا مثبت کردار ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری غلطی یہ کہ مذہب کو قومی یا بین الاقوامی مفادات کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر توسیع پسندانہ عزائم کے لئے مذہب کو استعمال کیا گیا ہے۔۔۔۔

دوسروں کو سننے اور سمجھنے کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ چیز ہے جو ہمیشہ ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں بھی علم ہو گا وہاں خود اعتمادی اور آزادی ہو گی۔ ایک تعلیم یافتہ شخص وہ ہوتا ہے جس میں خود اعتمادی ہو اور وہ دوسروں کی آزادی کے دائرے میں مداخلت نہ کرے۔۔۔۔

جب ہم آج کی مسلم دنیا کو دیکھتے ہیں تو ہمیں جمہوریت اور مذہب و حکومت کے تعلقات سے متعلق کئی مسائل نظر آتے ہیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض ممالک میں غیر جمہوری اور آمرانہ حکومتوں کو درست ثابت کرنے کے لئے اسلام کو استعمال کیا گیا ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب ہمیں سیاسی مفادات کی خاطر اسلام کے غلط استعمال کے مسئلے کا تفصیلی جائزہ لینا چاہیے۔ اسلام انسانی حقوق، سیاست میں عوام کی شمولیت، شہری آزادیوں، مساوات اور انصاف کو فروغ دیتا

ہے۔ یہ خدا کے نام پر خیالات کو دبا دینے کا نام نہیں ہے۔۔۔۔

رواداری کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

انتہا پسندی اور اعتدال پسندی کا بنیادی فرق رواداری ہے جو کہ معتدل سوچ کے اندر شامل ہے۔ یہ اعتدال پسندی ہی ہے جو کہ ''دوسروں'' کو برداشت کرنا سکھاتی ہے جبکہ انتہا پسندی میں ''دوسروں'' کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے سے مختلف نظریات کو برداشت نہیں کر سکتے تو پھر آپ کی اعتدال پسندی، اعتدال پسندی کے نام پر ایک اور انتہا پسندی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔۔۔۔

رواداری اور مثبت مکالمے کے معاملے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ خواہش ہے کہ تمام اختلافات کو ختم کر دیا جائے۔ یہ کوشش کہ دوسرے ہمارے سانچے میں ڈھل جائیں اور انہیں اسی وقت قبول کیا جائے جب وہ ہم سے مشابہ ہو جائیں (ہی رواداری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔)

انسانیت کو آج کی اس دنیا میں دو بنیادی مسائل کا سامنا ہے۔ ایک تو وہ مسئلہ ہے جس کا تعلق انسانی زندگی کو ختم کر دینے والے عناصر سے ہے۔ ان میں بھوک، غربت، بے روزگاری، عدم مساوات، اخلاقی انحطاط، مذہب سے دوری، ظلم، طبی سہولتوں کی عدم فراہمی، تعلیم کے مسائل، قانون کا عدم احترام، آمرانہ طریقے، سماجی کلچر کا فروغ نہ پانا، تاریخی اور ثقافتی اقدار کی تباہی وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرا مسئلہ پہلے سے کم اہم نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق بھی پہلے مسئلے سے ہی ہے۔ اس میں افراد کے مابین مناسب مکالمے کی عدم دستیابی، رواداری کی کمی، اختلافات کو برداشت نہ کرنا، اور اختلاف کے باوجود امن برقرار رکھنا شامل ہے۔ یہ کسی ایک علاقے یا ایک قوم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کا مشترکہ مسئلہ ہے۔۔۔۔۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

تجھے کیا ہوا

تو دکھی ہوا، میں دعا بنا
تو خفا ہوا، میں وفا بنا
تو جو زخم زخم سے چور تھا
تو میں درد دل کی دوا بنا
کھلے آسماں کے تلے تھا تو
تو میں ابر بن کے کھڑا رہا
میرے دوست تجھ کو یہ کیا ہوا
صف دوستاں سے نکل کے تو
صف دشمناں میں کھڑا ہوا
تجھے کیا ہوا، یہ مجھے بتا
تو نے کیسا مجھ کو صلہ دیا
کہ نکل کے میرے فسوں سے تو
کسی اور سمت ہی چل پڑا

روزہ جنت کا دروازہ ہے مگر
یہ دروازہ صرف وہی شخص کھول سکتا ہے جو
روزے کی مشقت کو تقویٰ کی کنجی میں بدل سکے

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ماہنامہ
اِنذار

ایک دعوتی و اصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان و اخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجیے...... یا
ایک پے آرڈر / بینک ڈرافٹ بنام ''ماہنامہ انذار'' بینک الفلاح المحدود (صدر برانچ)
اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوائیے
رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوائیے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے
ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے
ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جاسکتا ہے

Monthly
INZAAR

MAY 2018
Vol. 06, No. 05
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi